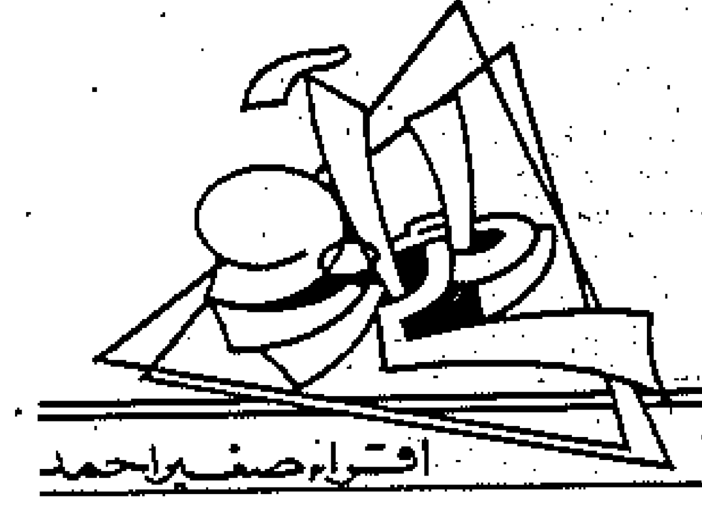
Aanchal, Sep-1999



اقراء صغیر احمد

ہے تار تار اب کے بھی دامانِ آرزو
حالات نے شعار کی پھر سے ستم کی خو
پھر بس رہی ہیں وحشتیں قلب و نگاہ میں
یہ کن قیامتوں کے مناظر ہیں چار سو



"قندیل بی بی! باہر اشرف صاحب کے دوست کوئی اہم پیغام لائے ہیں۔ وہ بلا رہے ہیں آپ کو!"

"مجھے...؟ مگر...؟" اس نے سراسیمہ انداز میں کھڑے ہو کر اپنے پیلے سوٹ پر نگاہ ڈالی جو ابٹن کی خوشبو سے مہکا ہوا تھا اور جا بجا اس پر ابٹن کے چھوٹے چھوٹے دھبے بھی سوکھ کر نمایاں ہو گئے تھے۔

"دیر نہ کریں بی بی! بہت جلدی میں ہیں۔ وہ صاحب کہہ رہے تھے قندیل بی بی سے کہو پانچ منٹ کے لیے بات کرلیں، بہت پریشان اور فکر مند ہیں وہ۔" ملازمہ پریشانی سے گویا تھی۔

"یاالٰہی خیر۔" اب جب کہ انہیں بارات لے کر پہنچنے میں دیر ہی کتنی رہ گئی ہے۔ ایسے حساس وقت پر کسی اجنبی کا، ان کے دوست کا پراسرار سا پیغام لانا اسے حواس باختہ کرنے لگا۔

"ٹھہرو، میں چچی جان کو ساتھ لے لیتی ہوں۔" اس نے سیاہ چادر اوڑھتے ہوئے اضطرابی لہجے میں کہا۔

"ایسا غضب نہ کرنا بی جی، آپ سے ہی کرنے والی کوئی خاص بات ہوگی۔ جبھی تو ان صاحب نے سختی سے تاکید کی ہے کہ بہت خاموشی سے آپ کو بلا کر لاؤں۔ کسی اور کو معلوم نہ ہو۔ بڑی بیگم صاحبہ کی عادت آپ جانتی ہیں۔ گھر مہمانوں سے بھرا ہوا ہے۔" ملازمہ حواس باختہ نظر آنے لگی۔

"اچھا!" اس نے گومگو حالت میں پریشان سی نگاہ سامنے چارپائی پر دوائیوں کے زیر اثر نیند میں ڈوبی ماں کے کمزور، زرد بیمار چہرے پر ڈالی جیسے فیصلہ نہ کرپا رہی ہو کہ جانا سود مند رہے گا؟

"چلیں جی! وخت (وقت) نہیں ہے۔ کوئی ادھر آجائے گا تو پھر آپ جا نہیں سکتی ہیں۔"

"شمو! تم جانتی ہو نا انہیں؟" اس نے پاؤں میں کالی دوپٹی کی چپل پہنتے ہوئے استفسار کیا۔

"ہاں جی، کافی شریف آدمی ہے، صورت سے مجھے بھلامانس لگتا ہے۔" اس کی زبان اقرار، جب کہ آنکھیں انکار کررہی تھیں۔

اشرف صاحب بارات لے کر پہنچنے والے تھے۔ ان کے نام کی مہندی اس کے ہاتھوں میں سجی ہوئی تھی۔ اس کے تن پر سجا پیلا جوڑا ابٹن سے مہکتا ان کے نام کا تھا۔ وہ تاحیات ان کی بیوی بننے والی تھی۔ ہمیشہ کے لیے ان کی تحویل میں جانے والی تھی۔ محض چند گھنٹوں کی مسافت تھی درمیان میں یہ دوست اجنبی پراسرار پیغام؟ اس سے تنہا اور سب کی لاعلمی میں ملنے کی خواہش...؟ اف! ہوا کیا ہے...؟ پروردگار! اشرف صاحب خیریت سے ہوں...." اس کی ذات اندیشوں کے بھنور میں ڈول رہی تھی۔

"صاحب جی! آگئیں قندیل بی بی!" ملازمہ جو بہت ہوشیاری سے اسے کوٹھی کے عقبی گیٹ سے نکال کر لائی تھی۔ تنگ گلی کے اختتام پر سلور گرے کار کی بیک سے ٹیک لگائے، ہونٹوں میں سگریٹ دبائے، بائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی میں کی رنگ گھماتے نوجوان سے مخاطب ہوئی تھی۔ جوان دونوں کو آتا دیکھ کر کافی مستعدی سے الرٹ ہوا تھا۔ ڈارک گلاسز میں پوشیدہ اس کی نگاہیں، سیاہ چادر کی اوٹ میں چھپے چہرے پر مرکوز ہوئی تھی۔ چھوٹے سے گھونگٹ سے صرف اس کی ستواں کھڑی اونچی ناک جھلک رہی تھی۔

"آپ قندیل یاور حسن ہیں؟" بلو جینز وہائٹ شرٹ میں ملبوس اس دراز قد، شان دار پرسنالٹی والے شخص نے اپنی بھاری و گونج دار آواز میں پوچھا جیسے تصدیق کرنا چاہتا ہو کہ وہ قندیل ہی ہے نا۔

"جی! آپ کون ہیں...؟ اشرف صاحب نے...." باقی ماندہ الفاظ اس کے ہونٹوں سے باہر نہ نکل سکے۔ کیونکہ بہت سرعت سے اس شخص نے جیب سے رومال نکال کر اس کی جانب بڑھ کر ایک ہاتھ سے اس کا منہ بند کرکے رومال ناک پر رکھ دیا تھا۔ اس کی گرفت فولادی تھی۔ اس اچانک افتاد پر وہ سنبھل نہ پائی تھی۔ اس کی گرفت سے نکلنے کے لیے وہ چند لمحے مزاحمت کرپائی تھی مگر پھر بے بس ہو گئی تھی۔ ناک اور ہونٹوں پر جیسے کسی نشہ آور دوا میں تر رومال کی تاثیر نے اسے لمحوں میں بے ہوش کرکے اردگرد سے بے نیاز کردیا تھا۔ وہ کسی درخت سے ٹوٹی شاخ کی طرح اس کے ہاتھوں کے حلقے میں ڈھیر ہو گئی تھی۔

اس نوجوان نے اسے کار کی پچھلی نشست پر لٹا کر اس کی سیاہ چادر اوڑھادی تھی۔ ملازمہ کو بھاری رقم دے کر کار برق رفتاری سے آگے بڑھنے لگی تھی۔ کوٹھی سے کچھ فاصلے پر بینڈ باجوں کے بے تحاشا شور کے ہمراہ بارات جاتی ہوئی نظر آئی۔ سرخ گلابوں سے سجی سنوری کار میں چند لوگوں کے ہمراہ سہرا سجائے دلہا پر اس کی نگاہ پڑی تو پراسرار سی فرحت بخش، تسکین آمیز مسکراہٹ اس کے بھرے بھرے سرخی مائل لبوں پر بے ساختہ ابھری تھی۔ اس نے اسی لمحے فاتحانہ پرغرور و گھمنڈی نگاہ بیک مرر سے پچھلی نشست پر بے سدھ پڑے چادر سے پوشیدہ وجود پر ڈالی اور کار تیزی سے آگے بڑھنے لگی۔

♣ ...... ♣ ...... ♣

"آپا! جوان بیٹیوں کے ہوتے ہوئے بھی میں تمہیں کام میں لگا دیکھتی ہوں تو خون جل کر خاک ہوجاتا ہے۔ لو بھلا یہ کوئی بات ہے۔ جوان جہان لڑکیاں چھت پر ٹنگی ہیں، کبھی محلے میں کہیں نہ کہیں گھسی ہوئی ملیں گی۔ ماں کو گھر کے کاموں میں کھپا رکھا ہے۔ یہاں تو الٹی گنگا بہہ رہی ہے۔"

"صفیہ، بیٹھو تو سہی، ارے میں خود زیادہ کام نہیں کرواتی بچیوں سے۔ یہ عمر تو آرام سے سکون سے گزار لیں۔ پھر اگلے گھر جا کر تو گھر کے بکھیڑوں میں پھنس کر ساری زندگی گزر جاتی ہے عورت کو سسرال میں بھلا کہاں سکون ملتا ہے؟" رضیہ اپنی سادہ و نرم طبیعت کے باعث چھوٹی بہن سے بولیں۔

"آپا! میکے میں کریں گی، تو سسرال میں بھی کرنے کی عادت ہوگی۔ ابھی ہڈحرام اور کاہل بنا رہی ہو تو آگے جا کر تمہارا وہ نام روشن کریں گی کہ تھو تھو ہوگی تمہاری تربیت پر۔ ہاں سچ کہہ رہی ہوں۔ ہم نے کیا کام نہیں کیا؟ میکے میں بھی گھر سنبھالا، غربت کے باعث ابا کا سہارا بننے کے لیے، اماں کی فکر کم کرنے کے لیے گھر بیٹھ کر لوگوں کی سلائیاں بھی کیں کپڑوں کی، کپڑے کاڑھ کر، سوئٹر بن کر بھی گھر بیٹھے مزدوری کی۔ شادی کے بعد سسرال میں بھی ایڑیاں رگڑ رگڑ دن گزارے ہیں۔ اب جا کے بیٹے ہونہار اور قابل نکل گئے تو دن اللہ نے پھیرے ہیں۔ مگر پھر بھی میں نے بیٹیوں کو اپنے چلن پر ہی چلایا ہے۔ پیسہ آجانے سے مزاج نہیں بگڑنے دیے۔ سلائی کڑھائی، کھانے پکانے، گھر کی صفائی غرض کہ ہر کام میں طاق کررکھا ہے ان تینوں کو۔ اب تو اپنے ہاتھ سے میں پھلی بھی نہ پھوڑوں۔ تینوں کے کام بانٹ رکھے ہیں مجال ہے جو کبھی آپس میں کام پر ست پڑجائیں۔ مگر تم نے تو آپا بالکل ہی اندھیر مچا رکھی ہے گھر میں مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔" صفیہ بیگم بڑی بہن کے قریب بیٹھتے ہوئے تیز و ناگوار لہجے میں محو گفتگو تھیں۔ جب کہ رفیہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ صفیہ چھوٹی ہونے کے باعث ان کی لاڈلی و چہیتی بہن تھی۔ ان کی محبت میں ہی وہ **بھانجیوں** کو سخت سست کہہ رہی تھیں۔

"صفیہ! جبھی تو میں نے ڈھیل دے رکھی ہے۔ ہم میکے سے محنت و مشقت کرتے آئے تھے۔ سسرال آکر اور زیادہ مشین بن گئے تھے، اب میں چاہتی ہوں بیٹیوں کو کم از کم اپنے گھر میں تو آرام کرنے دوں۔"

"ارے رہنے دو آپا! آج کل کی بچیاں ہماری طرح موم کی ناک نہیں ہیں۔ سسرال میں قدم رکھتے ہی ہر شے پر قبضہ جمالیتی ہیں۔ سسرال والوں کی خدمت تو کیا کریں گی؟ الٹی اپنی خدمت کروانے لگتی ہیں۔"

"اوہو خالہ جان آئی ہوئی ہیں۔ السلام علیکم خالہ جان! کب آئیں؟" اوپر سیڑھیوں سے اترتی انسین نے سر پر دوپٹا ڈالتے ہوئے مسکرا کر سلام کیا۔

"تمہاری بلا سے کبھی بھی آؤں؟ تمہیں کون سا خیال ہے خالہ کا۔" وہ ناراضگی سے گویا ہوئیں۔

"اکلوتی خالہ ہو۔ خیال کیوں نہ ہوگا؟ میں اوپر چھت پر کمبل سکھانے کے لیے ڈال کر آئی ہوں۔ موسم تیزی سے بدلنے لگا ہے۔ رات کو تو سردی لگنے لگتی ہے اس لیے میں نے سوچا ابھی سے کمبل اور لحاف دھو کر تیار کرکے رکھ دوں، سردیوں میں دن

چھوٹے ہوجاتے ہیں چھوٹے موٹے کاموں میں ہی دن گزر جاتا ہے۔" اُسین ان کے قریب بیٹھتے ہوئے کچھ اتنی محبت سے گویا ہوئی کہ ان کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔

"شکر ہے تمہیں تو کچھ ماں کا خیال ہے۔ نورین کہاں ہے؟" وہ بھانجی کو دیکھتی ہوئی پیار سے بولیں۔

"نورین؟ وہ سامنے خالہ رہتی ہیں ناں ان کے پوتے کی سالگرہ ہے وہاں گئی ہے آتی ہوگی۔"

"اُسین چائے بنالو' بازار سے کچھ چیزیں بھی منگوالینا۔ اب تمہاری خالہ کو کھانا کھانے کے بعد ہی جانے دوں گی' تنہا آئی ہو بچیوں کو ساتھ لے آتیں۔" اُسین کے بعد وہ صفیہ سے مخاطب ہوئی تھیں۔

♣ ...... ♣ ...... ♣

نہ معلوم وہ دن کا پہر تھا یا رات کا؟ جب اس نے آنکھیں کھولی تھیں' چند لمحے بے حس وحرکت پڑی نیم غنودگی کی حالت میں چھت پر لگے فانوس کو گھورتی رہی۔ یہ دورانیہ چند لمحوں پر مشتمل تھا۔ پھر یکلخت جیسے گھور اندھیرا روشنی سے جگمگا اٹھتا ہے۔ اسی طرح اس کے ذہن پر اضطراب وانتشار' خوف وگھبراہٹ حاوی ہوئے تھے۔ وہ جھٹکے سے کھڑی ہوئی تھی۔ گزرا ہوا ایک ایک لمحہ اس کی نگاہوں میں فلم کی طرح منظر بدلنے لگا تھا۔ اسے ابھی بھی اپنے منہ اور ناک پر اس عجیب بو والے رومال کی گرفت محسوس ہورہی تھی جس کی ناگوار بو اور فولادی گرفت کے باعث اپنا سانس بند ہوتا ہوا محسوس ہوا تھا اور واقعی وہ دم گھٹنے کی باعث بے ہوش ہوگئی تھی۔ اس نے متوحش سی وحشت زدہ نگاہیں کمرے میں چاروں سمت دوڑائیں۔ کمرا آرائش شدہ تھا' قیمتی پردے پڑے ہوئے تھے جس سے کمرے میں نیم اندھیرا تھا' بیڈ کے سائیڈوں پر رکھے لیمپ روشن تھے' منقش خوب صورت بیڈ پر پردوں اور کارپٹ سے میچ ہوتی ریشمیں بلیو بیڈ کور اور تکیے تھے' کمبل بھی بلیو اینڈ ریڈ کنٹراسٹ میں اچھا لگ رہا تھا' کمرے میں چاروں دیواروں پر پردے آویزاں تھے' کوئی دروازہ یا کھڑکی نظر نہیں آرہی تھی۔ اس نے اضطرابی ودیوانگی بھرے انداز میں پردے ہٹا کر دیکھے' تین اطراف سپاٹ دیواریں تھیں جن پر صرف الیکٹرک بورڈ نصب تھے' بائیں دیوار کے درمیان میں براؤن کلر کا لکڑی کا دروازہ نصب تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے بری طرح دروازہ کو پیٹ ڈالا اور متواتر کئی منٹ تک دروازے کو دھڑدھڑانے کے بعد بھی دوسری طرف سے کوئی رد عمل ظاہر نہیں ہوا تھا۔ اس کی دہشتیں وپریشانیاں حد سے سوا ہوگئیں۔ اس نے لپک کر کارنر پر رکھا پیتل کا بھاری گلدان اٹھالیا اور دونوں ہاتھوں میں مضبوطی سے پکڑ کر دروازے پر پے در پے وار کرنے لگی۔ "دروازہ کھولو' دروازہ کھولو' خدا کے لیے دروازہ کھولو......" وہ ساتھ ساتھ چلاتی جارہی تھی' آنسو اس کے سفید رخساروں سے پھسل پھسل کر چادر پر گر رہے تھے۔ وہ کہاں تھی؟ یہاں آئے کتنا وقت گزر چکا تھا؟ اسے یہاں لانے والا کون تھا؟ اور اس کا کیا مقصد ہے؟ کئی سوال اس کے دماغ میں ہلچل مچائے ہوئے تھے۔ ماں کا خیال اسے بے دم کرنے لگا تھا' بیمار ولاغر فالج سے معذور ماں کا خیال اسے انگاروں پر دوڑا رہا تھا۔ اس کی گمشدگی وہاں کیا قیامت برپا کرچکی ہوگی' اسے یہ خوفناک احساس تھا حیرت انگیز بات تھی' بے حد آراستہ' پیراستہ کمرے میں وال کلاک نامی کوئی شے نہ تھی۔ جیسے وقت سے یہاں کے مکینوں کو کوئی وابستگی وضرورت نہ ہو۔ یا دوسروں کا وقت خراب کرنے والوں کو اس کا احساس نہیں ہوتا۔

"کیا' بے ہودگی ہے یہ؟ نوک کرنے کی تمیز نہیں ہے آپ کو......؟" پیتل کے گلدان کے دھماکوں کا خاطر خواہ اثر دوسری جانب ہوا تھا۔ دروازہ کھول کر وہ قدرے درشت لہجے میں مخاطب ہوا تھا وہائٹ کرتا شلوار میں اس کی پیشانی کی طرح شکنیں تھیں' سرخ آنکھیں' بگڑے تیور ظاہر کررہے تھے۔ وہ گہری نیند سے بیدار ہوا ہے۔ دوسروں کی نیندیں حرام کرنے والے' خود کتنی پرسکون نیند سوتے ہیں۔

"مجھے گھر چھوڑ آئیں' خدا کے لیے مجھے گھر واپس چھوڑ آئیں۔" وہ بری طرح روتی ہوئی عاجزی سے فریاد کرنے لگی۔

"آپ سمجھ رہی ہیں وہاں سب آپ کی راہ میں پلکیں بچھائے بیٹھے ہوں گے......؟ پھولوں سے' کلیوں سے آپ کا سواگت ہوگا۔" اس کے لبوں پر طنزیہ زہر خند مسکراہٹ تھی' روشن براؤن آنکھوں میں تمسخر وحقارت تھی۔

"جانتی ہوں میں! آپ میرے لیے کانٹے پھیلا آئے ہیں' انگارے بچھا آئے ہیں' کیا بگاڑا تھا میں نے آپ کا......؟ کیوں کیا یہ سب؟ مجھے اس طرح اغوا کیوں کیا آپ نے......؟" اس کی سسکیاں گونجنے لگیں۔

"آپ کے حسن سے متاثر ہوکر ہرگز نہیں۔" تمسخرانہ انداز میں فوراً جواب دیا گیا۔

"انسان نہیں ہو تم! درندے ہو' جانور ہو۔" اس کا اطمینان وطمانیت سے نکھرا چہرہ اسے مشتعل کرگیا۔

"شٹ اپ' شٹ یور ماؤتھ۔ میں ایسا طرز گفتگو برداشت کرنے کا عادی نہیں ہوں۔ لہجہ درست کرو اپنا۔"

"مجھے آداب گفتگو سکھانے سے پیشتر آپ خود آداب انسانیت' احساس انسانیت سیکھیے۔ اس قدر رذیل' گھٹیا' انسانیت سے میرا کام کرنے کے باوجود آپ خود کو انسان سمجھ رہے ہیں؟ تف ہے آپ پر۔"

"ابھی آپ کا دماغ آؤٹ آف کنٹرول ہے۔ سو مجبوراً مجھے آپ کی بکواس نظرانداز کرنی پڑے گی۔" وہ بے نیازی سے شانے اچکا کر اندر کمرے کی طرف بڑھنے لگا۔ اس نے دروازہ بند نہیں کیا تھا وہ باتھ روم تھا جس کے ٹائلز خوب صورت تھے' کافی وسیع اور اسٹائلش انداز کا باتھ روم تھا۔ جس کے دوسرے دروازے سے ایک اور کمرا نظر آرہا تھا' دو کمروں کے درمیان میں یہ باتھ روم تھا اور دونوں دروازے بند ہونے کے باعث اسے دروازہ پیٹنے کی آواز کافی دیر سے اسی لیے سنائی دی تھی۔ اس کی سمجھ میں اب آیا۔

"آپ کو بالکل بھی احساس نہیں ہے؟ کتنی زندگیاں آپ نے تباہ کرڈالی ہیں۔ جیتے جی جہنم میں پھینک دیا ہے۔ کیا بگاڑا تھا میں نے......؟ میری بیمار ماں نے......؟ کیوں کیا ہے آپ نے یہ سب......؟"

"میرا موڈ نہیں ہے اس وقت بات کرنے کا' اور سوال جواب کرتے لوگ مجھے کبھی پسند نہیں رہے۔ پلیز! آپ اپنے کمرے میں جائیں' بزی ہوں میں اس وقت۔" وہ سامنے آئینے کے نیچے لگے شیلف سے شیونگ مگ نکال کر اس میں پانی بھر کر ڈیٹول کے قطرے ڈال کر کافی مصروف انداز میں گویا ہوا۔

قندیل کی سسکیاں' آہیں' آنسو کچھ بھی اس پر اثر نہ کرسکا تھا۔ وہ چند ساعت اس کی چوڑی پشت کو بے بسی وغصے سے دیکھتی رہی وہ اس کی ذات کو بالکل نظرانداز کرچکا تھا۔ جیسے وہ تنہا ہو' اس کے پاس کوئی ذی روح موجود ہی نہ ہو وہ پہلے کمرے میں جانے کے بجائے باتھ روم سے ملحقہ دوسرے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ وہ اسی بے نیازی سے شیو کرنے میں مصروف تھا جیسے مکمل اعتماد ہو کہ وہ کہیں بھاگ کر نہیں جاسکتی۔ یہ کمرا اس کمرے سے بھی زیادہ خوب صورتی سے ڈیکوریٹ تھا۔ سامنے بیڈ پر گرین بیڈ کور پر شکن تھا۔ کمبل ایسا ہی رکھا تھا سائیڈ ٹیبل پر لیمپ روشن تھے' دائیں لیمپ کے پاس ٹیبل پر رسٹ واچ' سگریٹ کا پیکٹ' سنہری لائٹر اور قلم کے نزدیک ہی موبائل رکھا تھا۔ کمرا نیم تاریکی میں ڈوبا تھا۔ دبیز پردے چاروں سمت لٹک رہے تھے۔

اس نے بھاگ کر سامنے کا پردہ ہٹایا تو وہ گلاس وال تھی۔ باہر کا منظر اس کے ہوش اڑانے کو کافی تھا چند قدم کے فاصلے پر لہراتا اٹھلاتا سمندر اپنی شدتوں سے اودھم مچائے ہوئے تھا۔ اونچی اور سرکش لہریں پوری زور آوری سے ساحل کی چمکتی سرخی مائل زرد ریت پر آکر شانت ہوجاتی تھیں' دھوپ پوری طرح پھیلی ہوئی تھی' پرندے لہروں کے سنگ بہتی مچھلیوں کا شکار کررہے تھے۔ اس کے دل کی دھڑکنیں منتشر ہونے لگیں' آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا' دھوپ اور سورج یعنی رات گزر چکی تھی' صبح کا سورج اس کی پاکیزہ اور شفاف زیست پر ذلت ورسوائی کے کبھی

نہ ختم ہونے والے اندھیرے پھیلاتا طلوع ہوا تھا۔ اف۔۔۔ کیا کیا الزامات کی بھرمار نہ ہوئی ہوگی؟ اسے رسوا کرنے میں کوئی کسر نہ رہ گئی ہوگی۔ چچی بیگم' چچاجان انکی فیشن ایبل بیٹیاں پہلے ہی ان ماں بیٹی کے وجود سے نالاں اور دستبردار رہتے تھے' اور اشرف صاحب۔۔۔؟ ان کی عزت پر کیسا داغ لگا ہے؟ وہ شریف وباکردار شخص جس نے اس کے ساتھ اس کی ماں کے وجود کو بھی تسلیم کیا تھا۔ بے شک وہ عمر میں اس سے تین گنا بڑے تھے' مگر وہ بہ خوشی ماں کو بھی ساتھ رکھنے پر راضی تھے اور جہیز کی بھی بالکل ڈیمانڈ نہ تھی جو سونے پر سہاگہ والی مثل پوری کررہی تھی۔ ماں جو اس کی کل کائنات تھی اس کو آرام پہنچانے کے لیے کوئی خوشی دینے کے لیے وہ زندہ جلنے کے لیے تیار تھی۔ مگر یہ ایکدم کیا ہوا تھا؟ منزل تک پہنچنے سے قبل ہی فضاؤں میں معلق ہوگئی تھی۔ اس کے دل ودماغ میں ایسا درد یکلخت اٹھا تھا کہ وہ تیورا کر نیچے گری تھی۔ سر بیڈ کے کونے سے ٹکرایا تھا' سائیڈ ٹیبل پر رکھا شیشے کا پانی سے بھرا جگ اور گلاس چھناکے سے نیچے گرے تھے۔ شور کی آواز پر اس نے چہرہ دھوتے ہوئے چونک کر دروازے سے اندر جھانکا تھا اور نل یونہی بیسن میں کھلا چھوڑ کر بوکھلا کر اندر آکر اس کی طرف بڑھا تھا' وہ ٹیڑھے میڑھے انداز میں پڑی تھی' اس کے ماتھے سے خون نکل کر لائٹ گرین کارپٹ میں جذب ہورہا تھا۔ اس سے کچھ ہی فاصلے پر شیشے کے جگ کے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے۔

♣ ۔۔۔۔۔ ♣ ۔۔۔۔۔ ♣

"نورین اس عمر میں مجھے رسوائیوں کی دلدل میں پھنسائے گی؟ کچھ تو اللہ کے قہر سے ڈر۔"

"میں کوئی غلط بات نہیں کررہی ہوں۔ مجھے ایک بار نہیں ہزار بار انکار ہے اس رشتے پر۔ مر کر بھی میں نہیں مانوں گی۔" نورین کے لہجے میں بغاوت وحد درجہ خودسری وخودپسندی بول رہی تھی۔

"تم بھی تم بچی ہو' نہیں سمجھ سکتیں اپنا اچھا برا' ایسی باتوں کا تجربہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ آتا ہے اور پھر راحیل جیسے ہونہار اور لائق لڑکے تو آج کل کہاں ملتے ہیں آسانی سے۔ دونوں بہنیں گھر میں راج کرتا' فاطمہ تمہاری سگی پھوپو ہے۔ اس کی پسند اور تمہارے مرحوم باپ کی خواہش پر یہ رشتہ بلکہ تم دونوں بہنوں کے رشتے بچپن میں ہی تمہارے باپ نے طے کردیے تھے۔ اب کیا اپنے مرے باپ کی خواہش کا بھی احترام نہیں کروگی؟" انہوں نے نئی امید سے بیٹی کے باغی چہرے کی طرف دیکھا۔ ان تین دنوں میں وہ کتنی اجنبی اور ازحد گستاخ اور بدلحاظ ہوگئی تھی۔ اس بیٹی پر تو انہیں بے حد اعتماد اور فخر تھا۔ انہوں نے کبھی اسے کسی بات پر نہیں ٹوکا تھا' محلے میں وہ سارا دن گھومتی رہتی تھی' سہیلیوں کے ساتھ بازار جاتی' شادی' منگنی' دیگر تقریبات میں وہ بہت اہتمام سے شریک ہوتی۔ انہوں نے کبھی کوئی بازپرس نہیں کی۔ ان کی محبت کے آگے بھائیوں نے بھی اعتراض نہیں کیا۔ اب تو گھر میں بہو بھی آگئی تھیں' وہ پیچھے سے کچھ بھی کہتی رہیں۔ مگر منہ در منہ انہیں بھی جرات نہ ہوئی کچھ کہنے کی۔ انہیں اپنی بیٹی پر بے حد مان تھا۔ وہ اپنے میکے میں بے حد گھٹی فضا میں رہی تھیں' باپ بہت سخت مزاج تھے' ماں کو لڑکیوں کا گھر سے نکلنا بالکل پسند نہیں تھا۔ سسرال میں بھی انہیں ایسا ہی ماحول ملا تھا۔ انہوں نے تہیہ کرلیا تھا۔ وہ اپنی بیٹیوں کو ایسا حبس زدہ ماحول نہیں دیں گی جو ان میں تشنگی ومحرومی کو جنم دے۔ افسین' نورین سے دو سال بڑی تھی اور بہت ذمے دار اور حساس تھی۔ جب کہ نورین دو بھائیوں اور ایک بہن سے چھوٹی تھی اور بہت نٹ کھٹ اور شوخ مزاج تھی' اس کی طبیعت باغ وبہار تھی ازحد منہ پھٹ اور صاف گو تھی وہ۔

تین دن پیشتر ان کی نند فاطمہ آئی تھیں۔ اپنا مدعا بیان کرنے کہ وہ افسین اور نورین کو بیاہ کرلے جانا چاہتی ہیں۔ کیونکہ دونوں کی منگنی بچپن میں ہی فاطمہ کے بیٹوں سے ہوگئی تھیں۔ انہوں نے بیٹیوں اور بہوؤں اور بہن وبہنوئی سے مشورہ کرکے ایک ماہ بعد کی تاریخ دے دی اور جب سے ہی نورین کے جوہر کھل

رہے تھے۔ محلے میں رہنے والے لڑکے یاور حسن سے وہ نہ معلوم کب سے محبت کی پینگیں بڑھا رہی تھی۔ جس بیٹی کو وہ بہت معصوم اور بھولی سمجھتی تھیں۔ اس نے بے حیائی وبے غیرتی کے رنگ خود پر اس قدر چڑھا لیے تھے کہ انہیں دو دن تو یقین ہی نہیں آیا کہ یہ ان کی وہ بیٹی تھی جسے وہ آج تک ننھی بچی سمجھتی رہی تھیں۔ اس نے سرے سے اس منگنی کو ماننے سے انکار کردیا تھا۔ شادی کرنے کو تیار نہ تھی۔ انہوں نے پیار سے' غصے سے' رعب سے ہر طریقے سے اس کے سر سے اس عشق کے بھوت کو اتارنے کی کوشش کی مگر یاور حسن کا عشق سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ ماں بہن' بھائیوں کی سب کی محبتوں پر یاور کی محبت بھاری تھی۔ وہ اس کی خاطر سب کو چھوڑنے کو تیار تھی۔ اس کے لہجے میں بغاوت وسرکشی چٹان کی طرح اٹل تھی۔ انہیں خاندان کا ناموس خطرے میں محسوس ہورہا تھا۔

"یہ کہاں کی دانش مندی ہے اماں! مردوں کی خواہشوں کے پیچھے زندہ لوگوں کو زندہ درگور کیا جائے اور جب ہمارا مذہب' ہماری شریعت اجازت دیتی ہے۔ لڑکیوں کو اپنی پسند وناپسند کا اختیار دینے کی۔ پھر کیوں ہمارے معاشرے میں ایسی ظالمانہ کارروائیاں ہوتی ہیں؟ لڑکیاں کوئی گائے' بکری تھوڑی ہیں جنہیں جس کھونٹے سے چاہے باندھ دیا جائے۔ یہ ساری زندگی کا معاملہ ہے۔ میں چند لمحے اپنی ناپسندیدہ چیز برداشت نہیں کرسکتی' ناپسندیدہ شخص کو ساری زندگی شوہر کے روپ میں کس طرح برداشت کروں گی؟"

"ماں' باپ کبھی اولاد کا برا نہیں چاہتے۔ شریعت ماننے سے میں انکاری نہیں ہوں۔ مگر ایسے فیصلے اپنی اولاد پر اعتماد اور مان کے سہارے کیے جاتے ہیں کہ اولاد اچھی طرح جانتی ہے اس کے لیے وہی منتخب کیا جائے گا' جو اس کے لیے بہترین اور سودمند ہوگا اور ایسے فیصلے کبھی برے ثابت نہیں ہوتے۔ یہ عشق اور محبت کبھی منزل پر نہیں پہنچاتے بیٹی! یہ وہ راہ ہے جس پر جو چلا ہے کبھی بھٹک کر صحراؤں' جنگلوں میں گم ہوگیا ہے یا لوگوں سے پتھر کھا کر دیوانگی کا لقب پا کر زخم زخم بھٹکتا رہا ہے اور آج کل کا عشق تو محض وقت گزاری ہے۔ شادی کے بعد کبھی سوچوگی بھی تو خود اپنی بے وقوفی پر ہنسوگی۔"

"یہ ایسی محبت نہیں ہے۔ تم مجھے بہلاؤ نہیں اماں! میں نے کہہ دیا کہ میں صرف یاور کی ہوں اور نہ ہی مجھ سے یہ منافقت ہوگی کہ دل یاور کے پاس ہے اور جسم راحیل کے حوالے کردوں۔ پہلو میں میرے راحیل ہو اور تصور میں یاور ہو۔ ایسا نہیں ہوسکتا اماں! جس کو دل دیا ہے جسم بھی اسی کے سپرد کروں گی۔" وہ بے باکی سے نڈر انداز میں بولی۔

"بے غیرت! بے حیا! بے ادب! شرم سے ڈوب مرنے کا مقام ہے ماں اور بہن کے آگے ایسی بے ہودہ بے لگام بکواس کررہی ہے۔ شرم وحیا بالکل ہی بیچ کھائی نامراد نے۔" بیٹی کے منہ سے نکلے نازیبا الفاظ ان کے باحیا خون میں آگ سی لگاگئے۔ انہوں نے غصے سے بے قابو ہوکر کئی تھپڑ اسے لگائے اور دکھ وغصے سے اپنا سینہ پیٹ کر رونے لگیں۔

"اماں! ایسے مت کرو۔" افسین ان سے لپٹ کر رونے لگی۔ وہ بھی نورین کو سمجھانے میں ناکام رہی تھی۔

"اگر میرے ٹکڑے ٹکڑے بھی کردوگی اماں! تو ہر ٹکڑے سے یاور! یاور! کی صدا اٹھے گی۔"

"میرے کس گناہ کی سزا ہے تو؟ آج بہوئیں گھر پر نہیں ہیں کل جب ان کے کانوں تک یہ باتیں پہنچیں گی تو دیکھنا کیسے بات کہاں کہاں پھیلے گی۔ خاندان کی عزت صدیوں میں بنتی ہے اور مٹی میں رلنے کے لیے ایک لمحہ ہی کافی ہے۔ کیا لوگوں کو میں منہ دکھاؤں گی؟ مجھے موت کیوں نہیں آجاتی؟"

"کیا ہوا اماں؟" بڑے بھائی لال بھبوکا چہرہ لیے اندر آئے۔ ان کا سخت لہجہ' شعلے اگلتی آنکھیں تخت پر اکڑ کر بیٹھی نورین پر تھیں۔ ان کے غصے اور جلال سے سارا گھر ہی کانپتا تھا۔ انہیں اچانک اندر آتے دیکھ کر دوپٹے میں منہ چھپائے روتی ہوئی اماں گھبرا کر کھڑی ہوگئی تھیں۔ افسین کا ڈر کے مارے جسم تھرتھر کانپ

رہا تھا۔ جب کہ نورین کے چہرے پر لمحے بھر کو خوف ابھرا تھا مگر پھر وہ نارمل ہوگئی تھی۔

"کیا ڈراما کررہی ہو؟ کیا برائی ہے راحیل میں؟" اماں کی طرف دیکھتے ہوئے انہوں نے خود پر ضبط کیا۔

"اچھا ہوا آپ نے سب کچھ سن لیا بھائی جان! میں یاور کو پسند کرتی ہوں' راحیل پسند نہیں ہے مجھے۔"

"اری کچھ تو شرم کر' بھائی کے آگے کیا اول فول بک رہی ہے؟" اماں سے رہا نہ گیا۔

"بولنے دیں اماں! اسے بولنے دیں یہ ہمارا پیار اور اعتماد بول رہا ہے۔"

"میں راحیل سے شادی ہرگز نہیں کروں گی' یہ میرا فیصلہ ہے بھائی جان!" ان کی نرمی اسے اور نڈر کرگئی۔

"اماں! دیکھا آپ نے؟ صفیہ خالہ جب بھی آئیں۔ انہوں نے یہی سمجھایا کہ لڑکیوں کو اتنی ڈھیل نہ دو۔ ہم نے بھی کئی مرتبہ آپ کو سمجھانا چاہا۔ مگر ہر دفعہ آپ نے ہمارے بولنے سے قبل ہی زبان بند کردی۔ آپ کی ناک کے نیچے یہ سب کرتی رہی اور آپ کی آنکھیں بند رہیں' حیرت ہے اماں میں نے تو سنا تھا بیٹیاں جوان ہوجائیں تو مائیں ان کے ہر قدم کی نگرانی کرتی ہیں۔ ان کے چہرے پر پھیلتے تمام رنگوں سے آشنا ہوتی ہیں۔ پھر یہ کیا ہوا ہے اماں! یہ بے دھڑک' بلاخوف ہماری عزت پامال کرتی رہی اور آپ بے خبر رہیں؟ اس کی آنکھوں پر بے حیائی و بے غیرتی کی پٹی بندھ گئی ہے۔ شادی ہونے میں چند دن باقی ہیں اور اس کی اتنی ہمت ہوگئی کہ شادی سے انکاری ہے۔"

"میں نے اعتماد کیا تھا' مجھے کیا معلوم تھا؟ میرا خون ہی مجھے ڈس لے گا۔" وہ آنسوؤں کے درمیان بولیں۔

"تم سے تو میں بعد میں نمٹ لوں گا۔ پہلے اس ذلیل آدمی کا سانس بند کرکے آتا ہوں' جس کی شہ پر تیری آنکھوں سے شرم و حیا مفقود ہوئی ہے۔ اتنی بری طرح ماروں گا اسے کہ اس کی آنے والی سات نسلیں بھی کسی لڑکی کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھنے کی جرات نہ کرسکیں گی اور تمہارا تو میں وہ حشر کروں گا کہ موت بھی تھرا اٹھے گی۔" وہ جنون کے عالم میں کچن سے چھری لے کر نکلے۔ ان کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا۔ غیرت سے خون جوش مار رہا تھا۔ اماں روتی ہوئی ان کو بازو سے پکڑ رہی تھیں' افشین بری طرح چیختی روتی ان کے قدموں میں لپٹ گئی تھی۔ چیخ و پکار سی وہاں مچ گئی تھی۔ وہ جنونی انداز میں خود کو چھڑانے کی سعی کررہے تھے۔ اماں اور افشین روتے ہوئے ہذیانی انداز میں انہیں واسطے دے رہی تھیں۔ ان کے خاندان پر عذاب ٹوٹنے والا تھا۔ بیٹی کی ضد اور رسوائی' یاور کا قتل' بدنامی ہی بدنامی تھی۔ اماں انہیں دروازے تک جانے سے روکتے ہوئے بری طرح ہانپ گئی تھیں۔ افشین ان کے قدموں سے لپٹی گھسٹتی ہوئی بڑھ رہی تھی۔ ان کا جنون کم نہیں ہورہا تھا۔ اللہ کے واسطے' افشین کے آنسو' سسکیاں' منتیں کوئی کارگر ثابت نہیں ہورہی تھیں۔

"رک جائیں بھائی جان! میں راحیل سے شادی کرنے کے لیے تیار ہوں۔" انہیں دروازے تک پہنچتے دیکھ کر خاموش کھڑی تماشا دیکھتی نورین سپاٹ لہجے میں گویا ہوئی۔ وہ رک گئے تھے۔ اماں اور افشین ان کو لے کر اندر آگئی تھیں اور سمجھا بجھا کر ان کا غصہ کم کرنے کی کوشش کررہی تھیں۔

"آپ کو مجھ سے وعدہ کرنا ہوگا۔ آپ کبھی یاور کو معمولی سی بھی تکلیف نہیں پہنچائیں گے۔ آپ کی بنائی ہوئی قربان گاہ پر اپنی بھینٹ یاور کی جان کے صدقے میں دے رہی ہوں۔" وہ روتی ہوئی گستاخ لہجے میں ان سے گویا ہوئی۔ اس کے چہرے پر ان کے لیے نفرت ہی نفرت تھی۔

"اماں! اس کو کہہ دیں میرے سامنے سے دفع ہوجائے اور میرے سامنے آنے کی کوشش کبھی نہ کرے۔"

"مجھے بھی آرزو نہیں ہے آپ کی صورت دیکھنے کی۔ میری بددعا ہے آپ کے ہاں بہت ساری بیٹیاں ہوں اور جب ان کی شادیاں ہوں تو وہ بھی میری طرح

زبردستی' بے جا اصول و خودساختہ رواجوں کی بھینٹ چڑھائی جائیں۔ پھر آپ کو میرا دکھ محسوس ہوگا اس لیے کہ آپ میرے باپ نہیں بھائی ہیں۔"

"ہاں' یہی تو دکھ ہے مجھے' یہی تو احساس میرے پاؤں کی زنجیر بن گیا ہے کہ تو میری بیٹی نہیں بہن ہے۔ خدا کی قسم! اگر بیٹی تجھ جیسی ہوئی بھی تو اسے زندہ زمین میں دفن کردوں گا۔ تجھ جیسی بیٹیوں پر آن و آبرو وار نہیں دی جاتی بلکہ خاندانی ناموس پر تم جیسی بیٹیوں کو قربان کردیا جاتا ہے۔ کچھ اور لڑکیوں نے یہ چلن اپنائے تو لوگ بیٹیوں کو زندہ دفن کرنا شروع کردیں گے بیٹیاں باپ بھائیوں کے اونچے شملے میں جڑا کوہ نور ہوتی ہیں' قدموں تلے آتا ارزاں پتھر نہیں۔ اماں! اب اس کے قدم گھر سے جب ہی نکلیں گے جب یہ ڈولی میں بیٹھ جائے گی۔"

♣ ــــــ ♣ ــــــ ♣

"کب تک چلے گا آپ کا یہ پروگرام؟" اس نے سرد و خشک ناگواریت اور بیزاریت سے لبریز لہجے پر سر اٹھا کر نہ دیکھا اور نہ ہی جواب دیا۔ البتہ آنسوؤں کی روانی میں مزید اضافہ ہوگیا تھا۔

"بہرحال مرضی ہے آپ کی! جب ناشتے کو دل چاہے تو کرلیجیے گا۔ کچن میں موجود ریفریجریٹر میں تمام سامان موجود ہے۔ سیل بند ڈبوں میں فش' چکن موجود ہے جو آپ کھانا چاہیں۔" اس کے ماتھے پر چوٹ گہری آئی تھی۔ فرسٹ ایڈ بکس یہاں موجود تھا۔ اس نے مہارت سے ڈریسنگ کردی تھی اور اپنے بیڈ پر ہی اسے لٹا دیا تھا۔ وہ بے ہوش تھی مگر جلد ہی اسے ہوش آگیا۔ پھر جو اس نے بیڈ پر گھٹنوں میں چہرہ چھپا کر رونا شروع کیا تو گھنٹوں گزر گئے وہ دوسرے کمرے میں تھا وقتاً فوقتاً اس پر بھی آکر نگاہ ڈال جاتا تھا اور اس کی حالت ہنوز دیکھ کر بے زاری سے پلٹ جاتا تھا۔

صبح سے اب دوپہر ڈھلنے والی تھی' اس نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ اب جو اس نے کھانے کو کہا تو جل گئی۔

"زہر کھانے کے قابل رہ گئی ہوں۔ زہر لادیں وہ کھاؤں گی۔" وہ ہذیانی انداز میں چیخی۔

"ضرور شوق فرمایئے گا۔ مگر یہاں نہیں۔" وہ اسی دھیمے و سرد لہجے میں گویا ہوا۔

"میں نے کیا بگاڑا ہے آپ کا؟ کیوں لائے ہیں آپ یہاں؟"

"کچھ فیصلے قدرت کے ہوتے ہیں جنہیں انجام دینے کے لیے تقدیر کسی بندے کا انتخاب کرتی ہے۔ میں نے وہی کیا ہے جو مجھے کرنا چاہیے تھا اور اپنے کیے پر میں قطعی شرمندہ یا نادم نہیں ہوں۔"

"مردہ ضمیر و ایمان فروش لوگ قطعی شرمندہ ہونا نہیں جانتے.......ـ"

"شٹ اپ! میں آپ کے ساتھ بے حد رعایت کررہا ہوں۔ مجھے حد سے تجاوز کرنے پر مشتعل نہ کرو۔" وہ ایکدم بپھر اٹھا تھا۔ پھر لمبے لمبے ڈگ بھرتا دروازہ زوردار آواز سے بند کرتا چلا گیا۔

زرد دھوپ ڈھل رہی تھی۔ شام نے اپنا گلابی آنچل آہستگی سے پھیلانا شروع کردیا تھا۔ گلاس وال سے نظر آتے سمندر کی لہروں میں سورج ڈھلنے کے ساتھ ساتھ شدت آتی جارہی تھی' دور افق پر پرندوں کی قطاریں اندھیرا پھیلنے سے قبل اپنے آشیانوں کی سمت محو پرواز تھیں۔ وہ بہت حسرت بھری نگاہوں سے ان آزاد فضاؤں میں پرواز کرتے پرندوں کو دیکھ رہی تھی۔ "کاش! کہ میں بھی آزادی سے اپنے مسکن کی طرف لوٹ سکتی بلاشبہ وہاں میرے لیے اب کوئی گنجائش نہ ہوگی مگر میری ماں کو اب بھی میری ضرورت ہوگی۔" صبح سے اب تک وہ فرار کی تمام کوششیں کرکے ناکام ہوچکی تھی۔ تمام گیٹ لاک تھے' اس نے سامنے موجود شیشے کی وہ دیوار بھی توڑنے کی کوشش کی تھی۔ مگر اس پر ضرب لگا کر اسے معلوم ہوا وہ شیشہ نہیں بلکہ اعلیٰ کوالٹی کا پلاسٹک تھا۔ جو بظاہر بہت نازک اور شفاف شیشہ نظر آتا ہے مگر ہاتھ لگانے سے محسوس ہوتا ہے پتھر کی طرح سخت ترین ہے۔ کمرے کے برابر لاؤنج تھا اور اس سے منسلک کچن تھا' سب میں ایسے ہی پلاسٹک کے شیشے لگے ہوئے تھے۔ وہ مایوس ہوکر بیٹھ گئی تھی۔ وہ دوبارہ کمرے میں نہیں آیا تھا۔ صبح سے

شام ہو رہی تھی وہ رات سے بھوکی‘ پیاسی تھی۔ مگر بھوک‘ پیاس‘ سکون سے وہ ماورا ہو چکی تھی۔ شدت گریہ سے سوجی آنکھوں میں بیمار و معذور ماں کا وجود جیسے منجمد ہو کر رہ گیا تھا۔ اسے اب کچھ بھی یاد نہیں تھا صرف ماں کے سوا‘ فالج زدہ ماں کا‘ تمام کام وہ کسی شیر خوار بچے کی طرح خود کرتی تھی۔ ان کا نچلا حصہ بالکل پتھر بن کر رہ گیا تھا جس سے وہ حرکت نہ کر سکتی تھیں وہ فیکٹری سے آکر ان میں مصروف رہتی تھی۔ اب جب کہ ایک رات‘ ایک دن گزرنے کے قریب تھا۔ کون انہیں سنبھال رہا ہوگا؟ ماں کی بے بسی و تکلیف کا خیال نئے سرے سے اس میں بیدار ہوا تھا۔ وہ کسی بپھری شیرنی کی طرح جنون میں اٹھی تھی دبے قدموں سے چلتی ہوئی کھلے دروازے سے اندر جھانکا۔ وہ اردگرد سے بے خبر بہت انہماک سے ٹیبل پر فائلز پھیلائے کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا‘ ہاتھ میں موجود گولڈن پین تیزی سے چل رہا تھا‘ کمرے میں بھاری پردوں کے باعث نیم اندھیرا تھا‘ ٹیبل پر جلتے لیمپ سے نکلتی مدھم روشنی میں وہ لکھنے میں مصروف تھا۔ اس کی پشت کو وہ قہر آلود نفرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ کتنا بے حس‘ سنگ دل و بے احساس شخص تھا۔ دوسروں کو آگ میں دھکیل کر کتنا بے پروا اور شانت تھا۔ لمحے کے ہزارویں حصے میں اس نے خوف ناک فیصلہ کرلیا۔ باتھ روم میں ڈیکوریٹ سنگ مرمر کا گلدان اس نے خاموشی سے اٹھالیا اور آہستگی سے اس کی طرف بڑھنے لگی‘ اس کی آنکھوں میں دیوانگی تھی‘ دبیز کارپٹ پر اس کے قدموں کی آواز نہیں ابھر رہی تھی۔ وہ اس کے سر پر پہنچ گئی تھی۔ اس کے لباس سے نکلتی ایٹن و مہندی کی بو نے اسے غالباً" اس کی موجودگی کا احساس دلایا تھا اس نے چونک کر پیچھے مڑ کر دیکھنے کی کوشش کی تھی اور اسی لمحے سنگ مرمر کے بھاری بھرکم گلدان کے پے در پے تین وار اس کے سر پر قیامت توڑ چکے تھے۔ وہ کوئی آواز نکالے بغیر کرسی سے نیچے گر کر ڈھیر ہو گیا تھا۔ خون تیزی سے نکل کر اس کے چہرے اور گریبان میں جذب ہو رہا تھا۔ قندیل نے ایک لمحے کو خوف زدہ نگاہوں سے اس کے خون سے رنگین چہرے اور شرٹ کو دیکھا۔ پھر تیزی سے اس کی شرٹ کی پاکٹ سے مین گیٹ کی لمبی چابی نکال کر برق رفتاری سے وہاں سے بھاگ لی۔ کی ہول میں چابی گھماتے ہی گیٹ کھل گیا تھا۔ وہ گیٹ بند کیے بغیر باہر آگئی۔ گھبرائی‘ متوحش نگاہ اس نے چاروں سمت دوڑائی۔ سامنے سمندر تھا‘ پیچھے ریت ہی ریت تھی۔ اونچی نیچی جگہوں پر ٹوٹی پھوٹی پہاڑیاں یا بے رنگ بدحال جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ اس نے بے تحاشا ریت کی طرف بھاگنا شروع کردیا۔ وہ اس علاقے سے ناواقف تھی‘ راستوں سے بے خبر تھی۔ اسے صرف اس قید سے رہائی چاہیے تھی۔ اس کی گرفت سے آزادی چاہتی تھی جو ابھی تک بہت شریف النفس باکردار ثابت ہوا تھا۔ مگر اس کے کردار پر رسوائی اور ذلت کی سیاہی پھیلا چکا تھا۔

ریت پر بھاگنا درکنار‘ اس سے چلنا دشوار ہو رہا تھا قدم ریت میں دھنس رہے تھے اور کئی جگہ بھاگنے کی کوشش میں وہ بری طرح گری تھی مگر وہ جلد از جلد یہاں سے بھاگ جانا‘ دور نکل جانا چاہتی تھی۔

سورج ڈوب چکا تھا‘ گلابی شام کی گلابیاں رات کی سیاہی میں تبدیل ہوا چاہتی تھیں۔ تیز ہوا میں خنکی بڑھتی جا رہی تھی۔ سمندر کا شور بلند سے بلند تر ہو رہا تھا۔ لہروں کی زور آوری‘ ساحل کو روندتی ہوئی ریت کے میدان کی سمت بڑھتی آرہی تھی۔ وہ سرخ اینٹوں سے بنا خوب صورت کاٹیج اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ وہ چادر کو سنبھالتی گرتی پڑتی آگے بڑھ رہی تھی۔ یہ ریت کا اونچا ٹیلا تھا اور یہاں سے سمندر ڈھلوان کی صورت میں نیچے بہہ رہا تھا۔ اس نے راستے میں پڑے پتھر کو پکڑ کر سانس درست کرنا چاہا۔ اسی دم اسے محسوس ہوا جیسے ریت اس کے قدموں کے نیچے سے لمحہ بہ لمحہ سرکتی جا رہی ہے‘ اس نے سنبھلنے کی کوشش کی۔ مگر بے سود اس کا جسم تیزی سے ریت میں دھنسے جا رہا تھا‘ جیسے کوئی طاقت وریلا اسے پکڑ کر اندر کی جانب کھینچ رہی ہو۔ اسے محسوس ہوا لمحے بھر میں وہ ریت میں دفن ہو جائے گی۔ خوف اور دہشت سے اس کی چیخیں نکلنے لگیں۔

♣ ــــــ ♣ ــــــ ♣

"اماں میرے ساتھ اچھا نہیں کر رہیں آپی! ایک دن بہت پچھتائیں گی‘ اماں اور بھائی بھی۔"

"نورین! خدا کے لیے اب تو عقل کے ناخن لو۔ اماں یا بھائی کوئی بھی تمہارا دشمن نہیں ہے۔ خود سوچو یاور اپنے گھر والوں کے لیے ناپسندیدہ شخص ہے‘ کاہل‘ ہڈحرام‘ کام چور محنت سے جان چرانے والا آدمی‘ جو خود جوان و توانا ہونے کے باوجود ماں باپ کا دست نگر ہو‘ وہ بھلا بیوی کو کس طرح کھلا سکتا ہے؟ بلکہ بھائی جان نے یہ بھی انکشاف کیا ہے کہ وہ جوا بھی کھیلتا ہے اور نشہ بھی کرتا ہے تم کیوں جان بوجھ کر کنویں میں چھلانگ لگانا چاہ رہی ہو؟" اقین نے بہن کو سمجھانا چاہا۔

"مرد کاروبار عورت کے نصیب سے کرتا ہے۔ بھائی جان اور چھان بین کریں‘ انہیں معلوم ہوگا اس میں دنیا بھر کی برائیاں ہیں۔ ہونہہ۔۔۔ وہ جیسا بھی ہے مجھے قبول ہوتا۔ ان لوگوں نے اس لیے یاور سے شادی نہیں کی کہ وہ کاہل و کام چور ہے۔ کل کو ان کے در پر آکر مجھے ہاتھ پھیلانا پڑتا۔ ہونہہ۔۔۔ میں بھوکی مرتی مگر کبھی ان سے بھیک مانگنے نہیں آتی۔" اس کے لہجے میں کبیدگی و نفرت تھی۔

"نورین! یہ تم ہو؟ اس گھر کی بیٹی! سچ کہتے ہیں بھائی جان! یاور نے تمہیں باغی و بے مروت بنا دیا ہے۔"

"جب اپنا ہی سکہ کھوٹا ہو بیٹی! دوسرے کو دوش نہیں دیا جاتا۔ بس اب ختم کردو اس منحوس سے کو‘ کل مایوں ہے۔ مہمان آج سے آنا شروع ہو جائیں گے۔" اماں نے اندر آتے ہوئے ان کی گفتگو سن لی تھی۔ اس تھوڑے عرصے میں ہی بیٹی کی بغاوت و سرکشی نے انہیں صدمے سے بیمار و کمزور کر ڈالا تھا۔

"کہاں جا رہی ہو تم؟" نورین کو تک سک سے تیاری کرتے دیکھ کر وہ گھبرا کر بولیں۔

"میں بھلا کہاں جا سکتی ہوں؟ اپنے گھر میں ہی قیدیوں کی طرح نگرانی میں رہتی ہوں۔" وہ استہزائیہ انداز میں ہونٹوں پر گہری لپ اسٹک پھیرتی ہوئی گویا ہوئی۔

"اماں مت منہ لگو اس کے یہ پاگل ہو گئی ہے۔" اقین نے ان کے حواس باختہ چہرے کو دیکھتے ہوئے بہن کی طرف نفرت سے دیکھا۔ جس کا دل ماں کی محبت‘ احترام‘ لحاظ سے مفقود ہو چکا تھا۔

"میرے گھر سے قدم نکالنے پر پابندی ہے۔ مگر یاور پر تو یہ پابندی نہیں ہے نا؟ اب جب کہ میں اس گھر سے رخصت ہونے والی ہوں تو آخری ملاقات بھی نہ کروں اس سے؟ یاور کو میں نے بلایا ہے وہ آتا ہوگا۔" نورین خود پر ڈھیروں پرفیوم اسپرے کرتی ہوئی اطمینان سے گویا ہوئی۔ ان کا دل جیسے بند ہونے لگا۔ انہوں نے پتھرائی آنکھوں سے سگی بیٹی کو دیکھا جو غیروں سے زیادہ غیر اور جلاد ہو گئی تھی۔

"دماغ درست ہے تمہارا؟ کیا بک رہی ہو تم؟ کیوں گھر میں خون خرابا کرواؤ گی؟ منع کردو اس ذلیل انسان کو اس گھر میں قدم نہیں رکھے۔ ورنہ بہت برا ہوگا۔" اقین نے اسے جھنجوڑ ڈالا تھا۔

"مجھے اس سے ملنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ اگر وہ یہاں نہیں آئے گا تو میں اس سے ملنے جاؤں گی۔"

"لاج رکھ لے میری عزت کی۔ نیچے کمروں میں بہوئیں موجود ہیں۔ دونوں بھائیوں کے گھر آنے کا وقت ہو رہا ہے۔ کیوں اس گھر میں آگ لگانا چاہتی ہے؟" اماں اسے کو [illegible] نے لگیں۔

"جو میرے دل میں آگ لگ رہی ہے۔ وہ سارے گھر میں‘ سارے جہان میں لگا دوں گی۔" وہ بل کھا کر پھنکاری۔

"بکواس بند کرو۔ منع کرو اسے یہاں نہیں آئے۔" اقین اسے گھسیٹتی ہوئی فون اسٹینڈ تک لے آئی۔

"ہرگز نہیں کوئی مرے یا جیے‘ مجھے پروا نہیں ہے۔ میری کس نے پروا کی ہے؟" وہ تنک کر بولی۔

"تجھے اس کتاب کا واسطہ منع کردے یا ور کو۔ ہمارا تجھے کوئی احساس کوئی پروا نہیں ہے۔ مگر اپنے مذہب سے تو نہیں پھری ہے تو۔" اماں نے دیوار گیر ریک میں رکھے سرخ چمکیلے جزدان میں ملفوف قرآن پاک ہاتھوں میں لے کر اس کے آگے فریادی لہجے میں کہا۔ اس نے چند لمحے اس پر آنکھیں مرکوز کیں۔ پھر تن فن کرتی نمبر ڈائل کرنے لگی۔ اماں دوپٹے سے اپنے آنسو صاف کرنے لگیں۔

♣ ـــــ ♣ ـــــ ♣

اچانک اور شدید سر میں لگنے والی ضربوں نے اسے چند لمحات کے لیے اردگرد سے بے خبر کردیا تھا۔ پھر سر سے اٹھتی بے تحاشا درد کی ٹیسوں نے اسے دس منٹ بعد ہوشیار کردیا تھا۔ خون تیزی سے سر سے نکلا تھا۔ اٹھ کر بیٹھتے ہوئے اس کی آنکھوں میں تارے ناچنے لگے تھے۔ کارپٹ اس کے خون سے رنگین تھا آسمانی کلر کی شرٹ بھی سرخ تھی۔ اس نے بیسن کے اوپر آویزاں آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا جو اپنے ہی لہو میں رنگا بڑا بھیانک لگ رہا تھا۔ اسے یکدم قندیل کا دھیان آیا۔ بے ساختہ اس کا ہاتھ جیب کی سمت گیا اور اس کا خدشہ درست ثابت ہوا۔ چابی کی عدم موجودگی اس بات کی گواہ تھی کہ وہ اسے زخمی کرکے فرار ہوچکی ہے۔ یہ انکشاف اس کے لیے بہت پریشان کن تھا۔ جلدی سے چہرہ دھوکر رومال زخم پر باندھ کر باہر آیا تھا۔ کمرے کا دروازہ اور مین گیٹ وا تھے۔ اس کی پیشانی پر تردد کی سلوٹیں نمایاں ہوگئیں دور دور تک آبادی یہاں نہ تھی' دائیں طرف سمندر تھا' بائیں طرف ریت کے وسیع ٹیلے تھے۔

شام گہری ہوگئی تھی' حسب معمول سمندر میں طغیانی بڑھتی جارہی تھی۔ حقیقتاً اس وقت وہ بے حد حواس باختہ و متفکر تھا۔ اگر اس لڑکی نے خودکشی کرلی تو؟ سمندر میں ڈوب گئی تو۔۔۔؟ اس کے حواس منتشر ہورہے تھے۔ وہ کمزور اور بزدل نظر آنے والی لڑکی اتنی حوصلہ مند' بہادر ہوگی کہ اسے زخمی کرکے بھاگ نکلے گی' اس کا ادراک اسے ہوتا تو وہ کبھی بھی اس سے غافل نہ ہوتا' اور اس طرح پریشانی میں بھی مبتلا نہ ہوتا' بے قراری و بدحواسی سے وہ چاروں طرف کا جائزہ لے رہا تھا۔

"معا" اس کی نگاہ سامنے نیم ریت پر ابھرے نازک قدموں کے نشانات پر پڑی۔ وہ برق رفتاری سے اس سمت بھاگا۔ قریب کے نشان لہروں نے مٹا دیے تھے۔ دور اکادکا نشان موجود تھے جو اس کی رہنمائی کے لیے مددگار ثابت ہوئے تھے۔ وہ ماہر کھوجی کی طرح آگے بڑھتا جارہا تھا۔ معا" اس کے کانوں میں نسوانی چیخوں کی آوازیں آنے لگیں تیز چلتی ہوا میں آوازیں کافی نمایاں تھیں۔ وہ دیوانہ وار اس ٹیلے کی طرف بڑھا تھا۔ جہاں سے آوازیں بلند ہورہی تھیں۔ اس کے سامنے لرزا دینے والا منظر تھا۔ قندیل کا آدھا جسم ریت کے اندر دھنس چکا تھا اور باقی دھنستا جارہا تھا قندیل کے ہونٹوں سے ہذیانی انداز میں چیخیں نکل رہی تھیں۔ آنکھیں دہشت سے پھٹی ہوئی تھیں' دونوں ہاتھ اس کے ہوا میں معلق تھے۔

اس نے سرعت سے آگے بڑھ کر اس کے دونوں ہاتھوں کو پکڑلیا۔ وہ ریت کی دلدل میں پھنس گئی تھی۔ وہ اسے باہر کھینچنے کے لیے پوری طاقت صرف کررہا تھا۔ وہ گویا منجمد ہوگئی تھی۔ اس کے نرم ہاتھ دہشت کے باعث برف ہورہے تھے۔ شدید تھکا دینے والی جدوجہد کے بعد اس دلدل سے آزاد ہوئی تھی۔ وہ سکتے کی کیفیت میں بیٹھی تھی۔ وہ قریب ہی نیم دراز اپنا بے ترتیب سانس درست کررہا تھا۔ سرد موسم میں بھی اس کے چہرے سے پسینہ پانی کی طرح بہہ رہا تھا۔

"چلو' دیکھا اپنی بے وقوفی کا انجام؟ اگر چند لمحوں کی تاخیر ہوجاتی تو اس ریت کی دلدل میں تم دفن ہوچکی ہوتیں اور کسی کو خبر بھی نہ ہوتی۔" وہ سرد ترش لہجے میں بولا تھا۔ اس نے موت کو اپنے سے چند قدم کے فاصلے سے واپس پلٹتے دیکھا تھا۔ اس کے حواس ابھی تک خوف کے زیر اثر تھے۔ وہ موت سے ڈرنے والی نہ تھی مگر ایسی گم نام موت اسے گوارا نہ تھی کہ کوئی قبر پر فاتحہ بھی نہ پڑھ سکے۔

وہ اس کے ساتھ ساتھ بے جان قدموں سے چلنے لگی' رات کی تاریکی پھیل چکی تھی۔ دن کی روشنی میں خوب صورت نظر آنے والا سمندر' خوف ناک سیاہ قد آور لہریں اڑاتا اتنا خوف ناک لگ رہا تھا کہ اس نے خوف سے جھرجھری لی تھی۔ شائیں شائیں چلتی ہوائیں' سمندر کا شور سماعت پر گراں گزر رہا تھا۔ جاتے وقت جو لہریں اس کے پاؤں کو چھو رہی تھیں ان لہروں کے قد اب اس کے گھٹنوں تک آپہنچے تھے۔

تھوڑا فاصلہ طے کرکے وہ اس کے ہمراہ کاٹیج کے اندر داخل ہوگئی تھی۔ اس نے زوردار آواز میں گیٹ بند کرکے لاک لگایا تھا اور اسے ایک طرف دھکیل کر اندر کمرے کے دروازے پر بھی لاک لگایا تھا۔ اس کے تیور بہت بگڑے ہوئے تھے۔ اس کی شرٹ پر خون کے دھبے دیکھ کر وہ کچھ نادم ہوگئی تھی۔

"یہ تمہاری پہلی غلطی تھی جو میں نے معاف کردی ہے۔ اگر دوبارہ ایسی حرکت کرنے کا سوچا تو سوچ لینا۔ میں تمہارا گلا دبا کر سمندر میں پھینک دوں گا۔" وہ غراتا ہوا اندر چلا گیا اور دروازہ بند کردیا۔

قندیل شل ہوتے اعصاب' ماؤف ہوتے سر کو پکڑ کر کارپٹ پر بیٹھ گئی۔ پرسوں سے اب تک اتنی پریشانی' تفکرات کی بھنور میں چکرائی تھی کہ اب سوچوں نے بھی قریب آنے سے معذرت کرلی تھی۔ آنسو بھی اندر ہی گر رہے تھے۔ ریت کے اس آسیب نے اس کی ہڈیوں کو گویا کاغذ کی طرح توڑ دیا تھا۔ جسم میں درد کی یورش بڑھتی جارہی تھی۔ اس نے آنکھیں موند کر دیوار سے ٹیک لگالی۔

"کھانا کھایئے۔" گمبھیر آواز پر اس نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھولی تھیں۔ جسمانی وذہنی پیکار نے اسے نامعلوم کتنی دیر غافل رکھا تھا وہ خود کو ملامت کرنے لگی' ایک اجنبی مرد کی موجودگی میں اسے اتنا غافل نہیں ہونا چاہیے۔

"مجھے بھوک نہیں ہے۔" اس کے دوبارہ متوجہ کرنے کے جواب میں اس نے کہا۔ ایک نظر اس کی طرف دیکھتے ہوئے آف وائٹ کلف شدہ سوٹ میں وہ خاصا نمایاں اور نکھرا نکھرا لگ رہا تھا سر پر اب رومال کی جگہ ڈریسنگ نظر آرہی تھی۔ سینٹر ٹیبل پر خاصا اہتمام نظر آرہا تھا۔ جو غالبا" اس کی غفلت کے دوران کیا گیا تھا۔

"میں نخرے برداشت کرنے' یا ناز اٹھانے کا قطعی عادی نہیں ہوں محترمہ! یہ جو کچھ میں کررہا ہوں۔ یہ میری طبیعت کے خلاف ہے۔ مگر یہ میرا پرسنل افیئر تھا۔ اس لیے مجبورا" بھگت رہا ہوں۔" وہ سرد مہری سے گویا ہوا۔

"مجھے نہیں کھانا۔" وہ مشتعل ہوکر چیخی تھی۔ مگر کمزوری ونقاہت کے مارے آواز دھیمی تھی۔

"دیکھو! مجھے سختی پر مجبور نہ کرو' میرے پروگرام میں صرف تمہارا' اغوا شامل تھا' قتل یا خودکشی نہیں۔ چلو اٹھو۔" اس نے سختی سے ذرا جھک کر اس کا بازو پکڑا تھا اور مخملی صوفے پر اسے دھکیل دیا تھا۔ اس نے سیدھی بیٹھ کر اپنی بے ترتیب ہوتے والی چادر کو درست کیا اور اسی طرح بیٹھی رہی۔

"کھاؤ! ورنہ مجھے یہ قطعی ناپسندیدہ کام اپنے ہاتھ سے مجبورا" انجام دینا پڑے گا۔"

"پہلے مجھے بتائیں۔۔۔؟ مجھے کیوں لائے ہیں؟ کیا دشمنی ہے ہم سے؟ یا اشرف صاحب سے۔۔۔؟"

"میں تمہارے کسی سوال کا جواب دینے کا پابند نہیں ہوں۔ کھاؤ خاموشی سے۔"

"میں بھی آپ کا حکم ماننے کی پابند نہیں ہوں' نہیں کھانا مجھے کچھ۔"

"اوکے' اگر تم یہی چاہتی ہو تو۔۔۔ ایسے ہی سہی۔" وہ ایک جھٹکے سے اس کے برابر میں آکر بیٹھا تھا۔ اس کے وجود سے اٹھتی مسحور کن مہک' اس کے مضبوط وجیہہ سراپا کی قربت' قندیل بوکھلا کر پیچھے ہوئی تھی۔ اپنی تنہائی و بے بسی' کمزوری کا احساس نئے سرے سے جاگا تھا۔ وہ کل سے اس شخص کے رحم وکرم پر تھی۔ وہ اکھڑ و بددماغ تھا۔ غصہ ور زور آور تھا' اس کے مزاج میں شعلے دہکتے تھے' انگ انگ میں جیسے سرکشی و ہٹ دھرمی کا راج تھا مگر اس کا کردار بہت

مضبوط تھا۔ شائستگی و شرافت اس کے انداز سے جھلکتی تھی۔ اس سے مخاطب ہوتے وقت اس کی نگاہیں ادھر ادھر ہوتی تھیں۔ مگر اس وقت اس کی بھرپور شخصیت اسے خوف زدہ کرچکی تھی۔ مبادا اس نے شرافت و بے نیازی کا لبادہ اتار پھینکا تو وہ مزاحمت بھی نہ کرپائے گی۔ لمحے کے ہزارویں حصے میں متضاد سوچوں نے اسے متوحش کرڈالا تھا۔

"کھاؤ۔" اس کے لہجے میں الجھن وناگواری تھی۔ کانٹے میں پھنسا چکن اس کی منہ کی طرف بڑھایا گیا تھا۔ لہجے میں کچھ ایسی ہی قطعیت وشدت پسندی تھی۔ اس نے میکانکی انداز میں کانٹا ہاتھ میں پکڑلیا۔

"کھالوں گی میں۔" پھر وہ خاموشی سے کھانے لگی۔ اس سے مطمئن ہوکر وہ کچن کی طرف بڑھ گیا۔ اس کا ذہن پھر ماں کی طرف بھٹک گیا نہ معلوم انہیں کسی نے دوا وقت پردی ہوگی یا نہیں؟ کھانا کس نے کھلایا ہوگا۔" اس کے حلق میں لقمہ پھنسنے لگا۔ پھر اس سے کھانا نہ کھایا گیا وہ بھاپ اڑاتی کافی کی مگ اٹھائے اندر آیا تھا۔ اسے افسردہ ملول دیکھ کر چند ساعت اس کے چہرے پر ملائمت چھا گئی تھی۔ مگر پھر فوراً ہی کوئی یاد کوئی منظر اس کی نگاہوں میں ابھرا تھا اور اس کے تیور پہلے سے زیادہ بدل گئے۔

"مجھے امید ہے اب کوئی احمقانہ حرکت نہیں کریں گی آپ! مگر پھر بھی تنبیہہ کردیتا ہوں۔" اس نے آگے بڑھ کر گلاس وال سے پردہ ہٹایا۔ باہر گھور اندھیرا تھا اور اس اندھیرے میں سمندر کی لہریں سیاہ آسیبی بلائیں لگ رہی تھیں۔ منظر کچھ اتنا ہی خوف ناک تھا کہ اس نے فوراً ہی نگاہیں جھکالی تھیں۔

"رات کو سمندر کا پانی باہر سکینڈ اسٹیپ تک آجاتا ہے اور اتنا طاقتور ہوتا ہے کہ پہاڑ کو بہا کرلے جائے اور ساتھ ہی آبی جانوروں کی بہتات ہوتی ہے جن میں آبی سانپ بہت کثرت سے ہوتے ہیں اور۔۔۔"

"یہ سب آپ مجھے کیوں بتارہے ہیں۔۔۔؟" وہ خوف زدہ لہجے میں چیخی۔

"تاکہ آپ فرار ہونا چاہیں تو یہ خیال ذہن سے نکال دیجئے گا کہ کوئی آپ کو بچانے آئے گا۔" وہ استہزائیہ انداز میں کہتا ہوا کافی کا مگ ٹیبل پر رکھ کر باتھ روم سے ملحق کمرے میں چلا گیا تھا اور ساتھ ہی لاک لگالیا تھا۔

♣ ــــــ ♣ ــــــ ♣

"جب تمہیں کسی اور سے محبت تھی تو کیوں میری زندگی میں فساد پھیلانے کے لیے چلی آئی ہو۔۔۔؟" راحیل نے تیز نگاہ ملگجے کپڑوں اور بکھرے بالوں والی نورین پر ڈالتے ہوئے اکتائے لہجے میں کہا۔

"اتنے عاجز آگئے ہو تو۔۔۔ طلاق کیوں نہیں دے دیتے مجھے؟" اس نے گزشتہ دو ماہ کے دوران ہزار مرتبہ دہرایا ہوا مطالبہ دہرایا۔ بھائی کے یاور کو قتل کرنے کے خوف نے اس کو مجبور کردیا تھا راحیل کی شریک حیات بننے پر مگر وہ تہیہ کرچکی تھی کہ راحیل کو شوہر کا درجہ کبھی نہیں دے گی اور اس کا عملی ثبوت اس نے شادی کی رات دے دیا تھا۔ راحیل کے کمرے میں آنے سے قبل ہی وہ اپنا روپ اجاڑ چکی تھی۔ نئی زندگی کی شروعات سے سرشار، سرخوشی کے عالم میں مسرتوں سے شاداں گنگناتا وہ کمرے میں داخل ہوا تو۔۔۔۔ نورین کو روایتی دلہن کے انداز میں دیکھنے کے بجائے اس کا دھلا ہوا شفاف چہرہ، سفید سوٹ میں ملبوس وہ نئی نویلی دلہن کے بجائے ایسی لگ رہی تھی جیسے ابھی بیوہ ہوکر بیٹھی ہو۔ اس کے کچھ بولنے سے قبل ہی وہ شروع ہوگئی تھی۔ یاور سے پہلی ملاقات، شادی سے انکار، پھر بھائی کی دھمکی اور اماں کی عزت بچانے کے لیے التجائیں واسطے، ایک ایک حرف راحیل کے گوش گزار اس نے نہایت ڈھٹائی اور بے خوفی سے کردیا تھا۔ راحیل پڑھا لکھا، شریف وحساس آدمی تھا۔ بہت ضبط سے اس نے برداشت کیا تھا۔ اس کی تمام مسرتیں، آرزوئیں اسی وقت جل کر خاک ہوگئی تھیں۔ بہت تحمل وبردباری سے اندر کے روایتی غیرت مند مرد کو روکا تھا۔ اس کی اعلیٰ تعلیم، بہترین تربیت و متین طبیعت نے اسے اس کا خون کرنے سے بہ مشکل روکا تھا۔

دونوں کے درمیان فاصلے صدیوں کی مسافتوں کے حائل ہوگئے تھے۔ اس نے اپنی انا کو زیر کرکے نورین کی طرف بڑھنا چاہا۔ مگر اس نے اپنی طرف آنے والے ہر راستے کو بند کردیا تھا۔ وہ زیادہ تر میکے میں ہی رہتی تھی۔ راحیل نے گھر میں کبھی پر بھی ظاہر نہیں کیے تھے اپنے معاملات۔ البتہ تحسین جو اس کی بڑی بھابی تھی اب، سب دیکھ رہی تھی۔ نورین بری طرح اسے جھٹک دیا کرتی تھی۔ اماں نے اس کے چلن کو ایسے سینے کا گھاؤ بنالیا تھا کہ وہ ان کی شادی کے ایک ماہ بعد دنیا چھوڑ چکی تھیں۔

"تم مجھے جتنا چاہو پریشان کرو مگر مجھ سے چھٹکارا صرف میرے مرنے کے بعد ہی مل سکتا ہے۔ جیتے جی میں تمہیں نہیں چھوڑ سکتا۔" راحیل، ضدی و ہٹ دھرم انداز میں کہنے لگا۔

"کیسے مرد ہو تم۔۔۔؟ مرد تو اپنی بیوی کی زبان سے کسی غیر مرد کا نام نہیں سن سکتے اور تم سب جانتے بوجھتے بھی مجھے طلاق دینے پر راضی نہیں ہو؟ کیسے مرد ہو؟" وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔

"یہ میری مردانگی ہی تو ہے جو تم جیسی عورت کو عزت سے رکھا ہوا ہے۔ طلاق عورت کے لیے شرمناک ہوتی ہے تو مرد کی غیرت پر بھی تازیانہ ہوتی ہے۔ افسوس! تمہارے بدلے کی حیا بھی مجھے کرنی پڑ رہی ہے۔ آیندہ بکواس مت کرنا۔ بلکہ کل شام کی فلائٹ سے تم میرے ساتھ لندن جارہی ہو۔"

"کیا مطلب؟ مجھ سے پوچھا بھی نہیں آپ نے۔۔۔؟" وہ بوکھلا اٹھی۔ یاور سے جدائی سوہان روح تھی۔

"تحسین بھابی نے کہا تھا تمہیں ٹائم پر بتاؤں۔" وہ سادہ فطرت کے باعث صاف گوئی سے بولا۔

شام میں سب گھر والے شادی میں گئے تھے۔ وہ سردرد کا بہانہ کرکے رک گئی تھی۔ راحیل جانے کے انتظامات میں دوپہر سے غائب تھا۔ گھر میں اس کے علاوہ کوئی اور نہ تھا ملازماؤں کو وہ چھٹی دے چکی تھی۔ اس کے ذہن میں شیطانی منصوبہ اسی وقت پیدا ہوگیا تھا، جب راحیل نے کل رات کی فلائٹ سے لندن جانے کی اطلاع دی تھی۔ اس نے تمام زیورات ونقدی سفری بیگ میں رکھی، چند جوڑے سوٹ کے رکھے اور تیزی سے کمرے سے نکل آئی۔ یاور کو وہ پروگرام پہلے ہی بتاچکی تھی۔ چوکیدار اسے آتا دیکھ کر متودب کھڑا ہوگیا تھا۔ اس کی تند مزاجی، چڑچڑے پن کے باعث تمام ملازم دور بھاگتے تھے۔ اب بھی چوکیدار نے اس کے کہنے پر گیٹ کھول دیا تھا۔ بہت پھرتی سے وہ آگے بڑھ گئی تھی، دو ٹیکسی اور ایک رکشا بدل کر وہ سوک سینٹر پہنچی تھی۔ یاور پہلے اسٹاپ پر اسے بے قراری سے ٹہلتا ہوا مل گیا۔ ٹیکسی سے اتر کر وہ اس تک پہنچ گئی۔ یاور نے اچٹتی سی نگاہ برقع میں ملبوس عورت پر ڈالی تھی جو اس کے قریب آرہی تھی۔

"یاور چلو۔" نورین نے لمحے بھر کے لیے دونوں نقاب چہرے سے ہٹائے تھے۔ اس وقت وہ ازحد پریشان اور بدحواس تھی۔ وہ ہمیشہ کے لیے اس گھر سے نکل آئی تھی۔ یاور نے اس کی دانش مندی کو سراہا تھا کہ وہ برقع اوڑھ کر اپنے چہرے کو چھپا کر آئی تھی۔

کچی بستی میں مقیم ایک دوست کے گھر یاور اسے لے کر آگیا تھا اس کا خیال تھا نورین کے فرار کی خبر اس کے شوہر اور گھر والوں کو ہوچکی ہوگی۔ وہ لوگ اسے ڈھونڈیں گے۔ ان کا خیال اس بستی کی طرف نہیں جاسکتا۔ وہ یہی سوچیں گے کہ وہ شہر چھوڑ چکی ہوگی۔ یاور کا دوست دو کمروں اور چھوٹے سے صحن کا کوارٹر انہیں کرائے پر دے کر چلا گیا۔

یاور کے ساتھ رہتے ہوئے اسے پندرہ دن ہوچکے تھے۔ اسے ذرا بھی ندامت وخوف نہیں تھا۔ وہ جو رقم لائی تھی وہ نہ نہ کرتے بھی یاور نے لے لی تھی اور شاہانہ انداز میں خرچ کررہا تھا۔ نورین اپنی محبت پاکے مگن تھی۔ اسے لگ رہا تھا وہ جنت میں پہنچ گئی ہے۔ یاور کی پیار بھری باتیں، ٹوٹ کر چاہنے کے انداز، اس کی نگاہوں کی وارفتگیاں، محبت کی جنوں خیزیاں، گناہ کے ہر احساس کو ذہن سے مٹاچکی تھیں، ضمیر پہلے ہی اس کا مردہ ہوگیا تھا۔

ایک دن یاور نے اطلاع دی کہ راحیل نے خودکشی کرلی ہے وہ اس سے نام نہاد بندھن کو توڑنے کا مطالبہ کرتی رہی تھی۔ اس نے قول کے مطابق اپنا کہا سچ کردیا تھا وہ مذہب کی رو سے اس کے نکاح سے خارج ہوگئی تھی اس کے مرنے کے بعد وہ آزاد تھی۔ یاور نے اور اس نے مل کر راحیل کی خودکشی کا جشن منایا تھا۔ اس نے بے حس، سنگ دل، ظالم و بے حیا سفاک ارزاں ترین عورت ہونے کا ثبوت دیا تھا۔ دونوں نے خاموشی سے نکاح کرلیا تھا۔ وہ یاور کے سنگ گویا افق کی بلندیوں پر محو پرواز تھی اور اس کی شادمانی محبت کی عمر اس پروانے کی طرح مختصر نکلی جو رات بھر شمع کے گرد نثار ہوتے ہیں صبح صادق کا پہلا اجالا یا تو اس کی موت کا فرشتہ بن کر وارد ہوتا ہے یا اس کے پر توڑ کر معذور کرکے پھینک دیتا ہے۔

پہلے روپے ختم ہوئے، پھر ایک ایک کرکے زیورات فروخت ہونے لگے۔ تین ماہ بعد یاور اپنے اصل روپ میں آچکا تھا۔ اماں کے اعتراض، بھائی کی شہادتیں، اُشین کی باتیں، اب سمجھ میں آنے لگیں جب پانی سر سے گزر چکا تھا۔ وہ پوری طرح ڈوب چکی تھی۔ یاور کاہل و بڈ حرام ہی نہیں پرلے درجے کا عیاش نشے باز تھا۔ اس کے بڑے بھائی نے اس کی ان ہی بد عادتوں سے عاجز و بدظن ہو کے گھر سے نکال دیا تھا۔

زیورات بھی تمام ختم ہوگئے تو وہ اس سے رقم کا مطالبہ کرنے لگا۔ وہ خود بالکل تہی دست ہوگئی تھی۔ زیور نام کی ایک کیل تک اس کی ناک میں نہ تھی سہاگ کی نشانی کے طور پر ہاتھ میں کانچ کی چوڑیوں سے بھی وہ محروم تھی۔ ایک روپیہ تک اس کے پاس نہیں بچا تھا۔ اب زندگی کا بھیانک ترین روپ اس کے سامنے تھا۔ یاور بات بے بات اسے روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیا کرتا۔ ہر وقت جھگڑا کرنا اس کا مشغلہ بن گیا۔ اس کی آنکھوں کے آگے پڑے پردے اب سرکنے شروع ہوئے تھے۔ اماں کی التجائیں سمجھانا اسے اب سمجھ میں آرہا تھا۔ اپنی بے حسی و ہٹ دھرمی پر اب وہ خون کے آنسو روتی تھی۔ اماں نے اتنا کچھ ہونے کے بعد اسے بددعا نہیں دی تھی۔ مگر ماں کے دکھے دل کی آہیں بددعاؤں سے زیادہ باا ثر ہوتی ہیں۔ راحیل جیسے شریف و ایثار پسند شخص کو اس کی بے غیرتی و بے گانگی نے حرام موت مرنے پر مجبور کیا تھا۔ یاور جب اسے بے تحاشا مار رہا ہوتا تو اسے شدت سے راحیل کی یاد آتی۔ اس نے اس کی تمام بے رخی لاتعلقی کے باوجود کبھی انگلی تک نہ لگائی تھی۔ اس کی ناپسندیدگی کے باوجود کتنا احترام و عزت دی تھی۔ وہ ناشکری تھی ماں، بہن، بھائیوں کی محبت، شوہر کے اعتماد و بھروسے کو قدموں تلے روند کر سراب کے پیچھے نکلی تھی۔ اس نے ہیرا چھوڑ کر پتھر کا انتخاب کیا تھا۔ اب ساری زندگی اس سے سر ٹکرا ٹکرا کر جان دینی ہوگی۔

یاور کے لبوں سے جھڑنے والے پھول انگارے بن کر نکلنے لگے تھے۔ آنکھوں میں محبت و وارفتگیوں کی جگہ شعلوں نے لے لی تھی۔ ساری دنیا کی عدالت سے بڑی عدالت ضمیر کی عدالت ہوتی ہے، ضمیر کی آواز پر اس نے کبھی توجہ نہیں دی تھی۔ اب جب کہ وہ تنہا اور تہی دست ہوگئی تھی۔ نادانیوں اور بے وقوفیوں کے احساس کے صحرا میں بھٹک رہی تھی۔ ضمیر کی حق و صداقت کی عدالت سے جو سزا اسے ملی ہے وہ اس نے بہ خوشی قبول کی۔ محبوب اور شوہر کا فرق اسے محسوس ہوچکا تھا۔ یاور کی ساری محبت و عشق اڑنچھو ہوگیا تھا۔ اس نے ایک فیکٹری میں اس کے لیے جاب تلاش کی۔ وہ خاموشی سے فیکٹری میں کام کرکے اپنا اور اس کا پیٹ بھرنے لگی۔ اس کے لبوں پر خاموشی کے قفل لگ گئے تھے۔ یاور سارا دن گھر میں سو کر گزارتا اس کے گھر میں قدم رکھتے ہی اس کی فضول بکواس شروع ہوجاتی، فیکٹری سے آتے وقت اکثر بس دیر سے ملنے کی باعث دیر ہوجاتی تھی۔ وہ بے دھڑک اس پر بدچلنی، آوارگی کے الزامات لگاتا کہ ”کس سے مل کر آرہی ہے، جو دیر ہوجاتی ہے؟“ شروع شروع میں اس نے اعتراض کیا تو حسب عادت وہ ہاتھ چھوڑ بیٹھتا اور کہتا۔ تجھ جیسی عورت پر بھروسا نہیں ہے مجھے جو اپنے شوہر کو چھوڑ کر غیر مرد کے ساتھ بھاگ سکتی ہے تو مجھے بھی چھوڑ کر کسی دوسرے مرد کے ساتھ بھاگ جائے گی۔“

یہ وہ مرد کہہ رہا تھا جس کی خاطر اس نے اپنی دنیا و عاقبت خراب کرڈالی تھی۔ جس کی خاطر فرشتہ صفت ماں کو ایسے کاری زخم لگائے تھے کہ وہ بہت کم عرصے میں دنیا سے چلی گئی تھی۔ یہ وہ محبت تھی جس کا فروغ آج کل گلیوں اور محلوں میں عروج پا رہا ہے، اب نہ معلوم اس کے ذمے دار کون ہیں۔ ڈش پر نظر آتے وہ رنگین و شرمناک مناظر، جو نوجوانوں کے کچے ذہنوں کے لیے سرسبز باغ ہوتے ہیں۔ نوخیز جذبات کے لیے گمراہ کن راہ، بے ہودہ لٹریچرز کی بہتات یا ماؤں کی سنگین بے خبری یا اعتماد جو وہ بیٹیوں پر کرکے ان سے بالکل ہی غافل اور بے پروا ہوجاتی ہیں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ جوان خون میں شیطان پوری طرح حاوی رہتا ہے۔ لمحے کی غفلت میں اپنا وار کر بیٹھتا ہے، لڑکیوں کی عصمت تو وہ بے بہا انمول شیشہ ہے جس پر غلطی سے بھی ٹھیس لگ جائے تو بال پڑجاتا ہے نوعمری کی محبت اس طوفان کی مانند ہے، جس کا کام صرف تباہیاں اور بربادیاں پھیلاتا ہے۔

یاور کے اس الزام و عدم اعتماد نے اس نورین کو ذبح کرڈالا تھا جو اس کی محبت میں باغی و بے حیا ہوگئی تھی پھر اس نے اس مالک سے لو لگالی جس سے غافل ہوتے پر وہ گمراہی میں پڑ گئی تھی۔

یاور کی مار، جھگڑے، الزامات، گالیاں، بہت اطمینان سے سہ جاتی اس نے کبھی اس کی زبان اور ہاتھ روکنے کی کوشش نہیں کی۔ خاموشی سے مار کھاتی رہتی، شکوہ کس سے کرتی؟ یہ عذاب تو اس نے خود منتخب کیا تھا۔ شوہر کی قدر نہ کی تھی، ماں کا دل دکھایا تھا۔ جس کا مداوا جان دے کر بھی نہ کرپاتی۔ یہ مار اور مشقت تو کچھ بھی نہ تھی اس کے گناہوں کے آگے۔

کچھ ماہ بعد ڈاکٹر نے اسے خوش خبری سنائی تھی کہ وہ جلد ماں بننے والی ہے۔ اس کی اجاڑ و ویران زندگی میں مسرت کی ننھی سی کرن جگمگائی تھی، جو یاور نے بہت سفاکی سے اس کی مسرت پامال کرڈالی یہ کہہ کر کہ وہ اس کے ہونے والے بچے کا باپ نہیں ہے۔ یہ آخری کیل تھی جو اس کے محبت کی تابوت میں گاڑی گئی تھی۔

اسے مار پیٹ کر وہ شام کو گھر سے نکلا تھا۔ وہ آج طبیعت خراب ہونے کے باعث فیکٹری نہیں گئی تھی۔ اسے گئے ابھی ایک گھنٹہ ہی ہوا ہوگا کہ اس کے دوست نے آکر اطلاع دی کہ جوا خانے میں کسی جواری سے یاور کا جھگڑا ہوگیا اور اس نے طیش میں آکر اس آدمی کا قتل کرڈالا تھا اور پولیس اسے پکڑ کر لے گئی تھی اور وہ ساکت سی بیٹھی رہ گئی۔

♣ ——— ♣ ——— ♣

”گھر جانے کے لیے بے قرار تھیں آپ؟ اب اتنی گم صم کیوں ہیں؟“ وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر کار اسٹارٹ کرتا ہوا طنزیہ لہجے میں برابر والی سیٹ پر بیٹھی قندیل سے مخاطب ہوا۔

”آپ کا کیا خیال ہے۔۔۔؟ مجھے مسرت و انبساط سے قہقہے لگانا چاہیے۔۔۔؟“ وہ زہرخند لہجے میں گویا ہوئی۔

”آئی ڈونٹ نو دس از یور پرسنل افیئر۔“ اس نے بے نیازی و لاتعلقی سے شانے اچکاتے ہوئے کہا۔ کار درمیانی رفتار سے پتلی سی سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ دائیں طرف ریت تھی اس سے آگے سمندر کی لہریں کسی الہڑ نوخیز دوشیزہ کی طرح اٹھلاتی، اچھلتی، کودتی نظر آرہی تھیں بائیں جانب ریت کا اونچا نیچا میدان تھا جس میں جابجا بھورے پتوں سے لدی، کہیں ٹنڈ منڈ جھاڑیاں نظر آرہی تھیں سورج کو گھٹاؤں نے اپنے سیاہ گیسوؤں کی لپیٹ میں لے رکھا تھا اس لیے موسم خاصا ٹھنڈا و ابر آلود تھا۔ آج ناشتے کے بعد اس نے ڈرامائی انداز میں کہا تھا وہ اسے گھر چھوڑنے جارہا ہے۔ اسے یقین نہ آیا کہ وہ سچ کہہ رہا ہے یا اسے بہلا رہا ہے۔ وہ فوراً ہی پورچ میں کھڑی کار کی طرف بڑھ گیا تو اسے یقین کرنا پڑا۔ ماں سے ملنے کی سرخوشی اس کے اندر برق کی طرح دوڑی تھی پھر بہت سارے چہرے اس کی نگاہوں میں گھومے تھے۔ برسوں شام کا ایک ایک منظر اس کی نگاہوں میں رقصاں ہوگیا وہاں جاکر جس انداز میں اس کا سواگت ہونا تھا۔ اس سے اس کے

اعصاب ٹوٹنے پھوٹنے لگے تھے۔

”آج ایک مدت بعد میں پرسکون نیند سوؤں گا۔“ اس کی آواز مسرتوں سے لبریز تھی وجیہہ و پرکشش چہرے پر جیت، فتح کامرانی کا آبشار سا بہہ رہا تھا۔ وہ کھول کر رہ گئی۔

”اب تو بتادیں؟ کس کا انتقام لیا ہے آپ نے مجھ سے؟ کیا مقصد تھا آپ کا؟“

”میں نے پہلے بھی آپ سے کہا تھا۔ اس سوال کا جواب مجھ سے نہ پوچھیں آپ!“

”میری زندگی برباد کرکے کیا ملا آپ کو؟ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا آپ نے مجھے!“

”آپ غلط بیانی سے کام لے رہی ہیں جس طرح آپ آئی تھیں، ایسی ہی واپس جارہی ہیں۔ میں دھوکا باز لوگوں کو پسند نہیں کرتا۔ اور نہ ہی امانت میں خیانت پسند ہے مجھے!“ اس نے موڑ کاٹتے ہوئے آہستگی سے جواب دیا کار اب چھوٹا سا پل عبور کررہی تھی جس کے نیچے پانی بہہ رہا تھا۔

”نہیں سمجھ سکتے آپ کہ لڑکی ہونا بعض گھرانوں میں کتنا عظیم گناہ ہوتا ہے۔ میری نیک نامی، پاکیزگی، عزت نفس سب کا قتل کرڈالا ہے آپ نے۔ عورت کبھی مجبوراً رات کو گھر میں گھسے تو ناقابل قبول ہوتی ہے اور میں جو دو رات گھر سے باہر گزار کر جارہی ہوں۔ اور وہ بھی ایسے کٹھن حالات میں جب میری بارات آکر لوٹ گئی ہوگی، میری اچانک گمشدگی کو کس گھناؤنے فعل سے مثل دی گئی ہوگی، اس کا احساس شاید آپ کو نہیں ہوگا۔“ ہوگا وہ بھرائے ہوئے لہجے میں بولی۔

”ہمیں تو بہت پہلے سے احساس ہے اس اذیت کا کہ کتنی تکلیف دہ اذیت ہوتی ہے۔“ دل جلانے والے لہجے میں کہا گیا۔

”مسٹر! تم جو کوئی بھی ہو۔ مجھے سولی پر چڑھا کر سمجھتے ہو سکون سے رہو گے؟ پرسکون نیند سوؤ گے؟ نہیں ہرگز نہیں، میری بددعا ہے تمہیں کبھی سکون نصیب نہ ہو، تم نیند کو ترسو، سکون کو ترسو، جس طرح مجھے برباد کیا تم نے اسی طرح تم بھی برباد رہو۔۔۔۔“ اس کے سفید رخساروں پر آنسو تیزی سے بہہ رہے تھے۔ سسکیوں کے دوران اس نے اسے بددعائیں دی تھیں۔

اس نے روتی، سسکتی قندیل کی طرف کوئی توجہ نہ دی تھی بہت فریش موڈ کے ساتھ ڈرائیونگ کرتا رہا تھا۔ ڈھائی گھنٹے کی فاسٹ ڈرائیونگ کے باعث وہ کار مطلوبہ رہائش گاہ کے آگے روک چکا تھا۔

”کاش! میں اس وقت آپ کے ماں باپ کے تاثرات اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتا۔۔۔۔؟ مگر اوکے بائے بائے۔۔۔۔“ اس نے اس کے زرد پڑتے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے استہزائیہ انداز میں کہا اور اس کے اترتے ہی کار تیزی سے آگے بھگا لے گیا۔

♣ ـــــ ♣ ـــــ ♣

”خیریت تو ہے بیٹی! کیوں پریشان گھوم رہی ہو؟“ خالہ جان عینک درست کرتی ہوئیں ان کے قریب استفسار کرنے لگیں۔

”خالہ جان! معاذ پرسوں کہہ کر گئے تھے، شکار پر جارہے ہیں، دو دن بعد یعنی آج شام کو واپس آجائیں گے مگر اب تو رات ہورہی ہے اور ان کا ابھی تک واپسی کا پتا نہیں ہے۔“

”اے لوبی! تم بھی حد تک کرتی ہو، راستوں میں دیر سویر ہوجاتی ہے اور پھر معاذ تو اپنا بہت ذمے دار اور سنجیدہ بچہ ہے، ہاں اگر اس کی جگہ عمیر ہوتا تو فکر و پریشانی کی بات تھی کہ وہ تو ہے ہی حد درجہ لاابالی، غیر ذمے دار اور منچلا، آتا ہوگا معاذ بیٹا انشااللہ۔۔۔۔“ انہوں نے اطمینان سے تسلی دی۔

”نانی جان! آپ نے میرا نام لیا، اور میں حاضر ہوا۔“ عمیر شرارت سے مسکراتا اندر داخل ہوا۔

”یہ تو وہی مثل ہوئی کہ شیطان کا نام لیا اور وہ حاضر ہوا۔“

”سوچ لیجیے؟ بہرحال؟ آپ میرے بزرگوں میں شمار ہوتی ہیں۔“ وہ شوخی سے جھک کر بولا۔

”یعنی مجھے شیطان کی نانی بنا رہا ہے؟ لاحول

ولا۔۔۔۔ لڑکے معاف کر مجھے۔“

”عمیر! معاذ ابھی تک شکار سے واپس نہیں آئے ہیں۔۔۔۔“ انہوں نے شکایتی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”معاذ بھائی کچھ دیر قبل آچکے ہیں آپ جب نانی جان کے ساتھ پڑوس میں گئی ہوئی تھیں۔“

”میں پہلے ہی کہتی تھی۔ معاذ بہت ذمے دار اور سلجھا ہوا بچہ ہے۔ اس کی طرف سے فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ چلو جلدی سے کھانا لگواؤ۔ بچہ تھکا ہوا آیا ہوگا۔ کھانا کھاکر آرام کرے گا۔“ وہ معاذ کی پرخلوص و سنجیدہ طبیعت سے بہت خوش تھیں۔ عمیر اپنی بے چین شوخ طبیعت سے انہیں اکثر عاجز کردیا کرتا تھا۔ کھانے کی ٹیبل پر ان تینوں کے بعد وہ آیا تھا سلام کرتا ہوا کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ گرے شلوار سوٹ میں وہ فریش سا خاصا خوش نظر آرہا تھا۔

”یہ سر پر چوٹ کیسے لگ گئی؟“ سلام کا جواب دے کر وہ فکر مندی سے اس کے سر پر نظر آنے والی ڈریسنگ دیکھ کر پریشانی سے گویا ہوئیں۔ نانی نے بھی اپنی عینک درست کی تھی۔

”اوہ! کوئی خاص نہیں، معمولی سے چوٹ لگ گئی تھی اب تو کافی بہتر ہے۔ جلد زخم بھر جائے گا۔“ وہ ان سے نگاہیں چراتا ہوا اسپرنگ فرائیڈ چکن کی ڈش اپنی طرف رکھتا ہوا گویا ہوا۔

”ارے کہیں انسانوں کے شکار پر تو نکل نہیں گئے تھے؟ بھائی جان! یہ زخم کسی شیر ٹائپ کی خونخوار دوشیزہ نے تو نہیں لگادیا؟“ عمیر پلاؤ پلیٹ میں ڈالتا ہوا شرارت سے چہکا۔

”سٹوپڈ بوائے!“ وہ خاصا جز بز ہوا بعض اوقات مذاق کے پیرائے میں کہی گئی بات کتنی صادق ہوتی ہے۔

”تم بھی حد کرتے ہو؟ کبھی انسانوں کا شکار بھی کیا جاتا ہے؟“ نانی عمیر سے مخاطب ہوئیں۔

”ہا۔۔۔۔ ہا آپ اتنی بڑی ہوگئیں نانی جان! آپ کو معلوم ہی نہیں کہ انسانوں کا شکار بھی ہوتا ہے یہ آئے دن جو آپ اخبارات میں پڑھتی ہیں کبھی ہنگاموں میں لوگ ہلاک ہوتے ہیں تو کبھی اچانک ہونے والی فائرنگ کی زد میں لوگ ہلاک کردیے جاتے ہیں تو کیا ہوتا ہے؟ انسان ہی تو انسان کا شکار کرتا ہے۔ آج کل تو لوگوں نے جنگلوں کو چھوڑ کر شہروں کا رخ کرلیا ہے۔“

”خاموشی سے کھانا کھاؤ۔ کبھی تو آرام بھی دے دیا کرو اپنی زبان کو۔“ معاذ کو گراں گزر رہی تھی اس کی گفتگو۔ بھائی کے تیکھے تیوروں سے وہ خوف زدہ رہتا تھا۔ سو خاموشی سے کھانے میں مگن ہوگیا۔

”آپ نے شام کو کہا تھا واپس آنے کو اور رات کردی۔ جانتے بھی ہیں چند لمحے کی تاخیر مجھے ازحد پریشان و متفکر کردیتی ہے۔“ انہوں نے پیار بھری خفگی سے لائق فائق بیٹے کو دیکھا۔

”سوری ماما! میں آتو شام کو ہی گیا تھا۔ کچھ وقت قبرستان میں لگ گیا تھا۔ چچا جان کی قبر پر۔“

”مردوں کو قبرستان جاتے رہنا چاہیے مگر بیٹا! ہر کام ایک حد، اعتدال میں بہتر رہتا ہے۔ جو کام حد سے گزر جائے وہ انتہا پسندی اور جنون کہلاتا ہے۔ یہ دونوں جذبے ہی خطرناک ہیں۔ آپ کا پابندی سے صبح و شام راحیل کی قبر پر گھنٹے گزارنا مجھے وحشت میں مبتلا کرتا ہے۔ پلیز بیٹا! آپ صرف جمعرات کو جایا کرو اور فاتحہ وغیرہ پڑھ کر آجایا کرو۔ نہ معلوم کیوں میرا دل ہولتا رہتا ہے؟“ ماما کے لہجے میں ایک اضطراب اور وحشت تھی۔ بیٹے کی اس برسوں پرانی عادت سے وہ کسی ناگہانی خطرے کی آہٹیں سنتی تھیں۔

”اوکے ماما! اب ایسا ہی کروں گا کیونکہ چچا جان کی برسوں کی بے قرار روح کو قرار آچکا ہوگا۔ ان کو قبر میں پہنچانے والے اب خود اپنی موت کی دعائیں مانگ رہے ہوں گے۔“

”کیا مطلب میں سمجھی نہیں؟“ بیٹے کے چہرے پر ابھرتے تاثرات کچھ ایسے ہی خوف ناک تھے کہ ان کے علاوہ نانی جان اور عمیر کے چہرے پر بھی تجسس آمیز دہشت چھاگئی تھی۔ پھر وہ ایک ایک لفظ انہیں بتاتا

ڈرائنگ روم میں یکلخت سناٹا چھا گیا تھا۔ محض اس کی گمبھیر آواز گونج رہی تھی۔ ”دادی جان نے عہد لیا تھا مجھ سے کہ راحیل چچا کی جوان موت کا بدلہ میں ضرور لوں گا۔ جس اذیت سے ان کی جان نکلی ہوگی‘ وہ تکلیف میں آج تک محسوس کرتا ہوں۔ شریف‘ پُروقار چچا لوگوں کی باتیں برداشت نہ کرسکے‘ دوستوں کے طعنے ان کی شرافت برداشت نہ کرسکی۔ حالانکہ انہیں اس عورت کو شوٹ کرنا چاہیے تھا۔ جو اپنی ہرجائی طبیعت و بے حیائی کے باعث انہیں چھوڑ کر فرار ہوگئی تھی۔ مگر چچا کی محبت دیکھیے اس کا پتا انہیں معلوم ہوچکا تھا۔ مگر انہوں نے اسے کچھ نہ کہا‘ خود موت کو گلے لگا بیٹھے۔ میں نے دادی جان سے عہد کیا تھا کہ ایسی ذلت و رسوائی سے اس عورت اور مرد کو ضرور روشناس کرواؤں گا۔ اپنے اس عہد کو مستحکم کرنے کے لیے میں روزانہ صبح و شام چچا کی قبر پر جاتا تھا۔ تاکہ گزرتے وقت کے ساتھ میرا عہد دھند کی لپیٹ میں نہ آجائے۔

”بھا... بھا... بھائی! آپ... آپ... نے... لڑکی... اغوا کی؟“ عمیر کی آنکھیں حلقوں سے باہر تھیں۔ منہ پورا کھل گیا تھا۔ لڑکیوں کی پرچھائیں سے بھی گریزاں بھائی کی بات حیرانی در حیرانی میں مبتلا اسے کرگئی۔

”یہ کیا کیا آپ نے؟ میں نے آپ دونوں کی تربیت ایسی نہیں کی تھی‘ میں نے اپنے بچوں کو روشن چراغ بنایا تھا۔ پر آپ تو ایک گھر جلا کر آگئے۔ ایک عورت کے کیے کی سزا دوسری بے گناہ‘ بے خطا لڑکی کو دینا کہاں کا قانون ہے معاذ؟ مجھے یقین نہیں آرہا... آپ ایسی گھٹیا و بیچ حرکت کر گزرے ہیں؟ ایک لڑکی کی تباہی و رسوائی پورے خاندان کو لپیٹ میں لے لیتی ہے۔ آپ کیوں اتنا اخلاق سے گر گئے؟“ ماما متوحش نگاہوں سے ہکا بکا بیٹھے معاذ کو دیکھ رہی تھیں۔

”آپ کو اس لڑکی سے ہمدردی ہورہی ہے؟ اس خاندان کی رسوائی کا دکھ ہے آپ کو؟ جن کی وجہ سے آپ بھی سسرال میں عزت و مقام نہ پاسکیں‘ زندگی کا طویل حصہ آپ نے ان کے ناکردہ گناہوں کی سزا کاٹی ہے۔ بابا نے کبھی آپ کو وہ مقام نہیں دیا جو آپ جیسی خدمت گزار‘ باوفا‘ بھرپور صبر و استقامت رکھنے والی بیوی کو ملنا چاہیے۔ بابا آخری دم تک آپ سے بدگمان‘ نامہربان تھے یہی جذبات وہ دل میں لیے دنیا سے چلے گئے۔ آپ نے اپنی بہن کی زیادتیوں کی سزا سود سمیت کاٹی ہے اب بھی آپ ان کا درد محسوس کررہی ہیں؟“

”خاموش ہوجاؤ معاذ! جس آگ میں‘ میں جلتی رہی ہوں۔ کسی معصوم کو جلانا نہیں چاہتی۔“ وہ تیزی سے اٹھ کر وہاں سے چلی گئیں۔

معاذ کی کشادہ پیشانی پر تردد کی شکنیں سمٹ آئیں۔

♣ ---- ♣ ---- ♣

”ارے اس بدذات کو گھر میں گھسنے کس نے دیا...؟ تیری ہمت کیسے ہوئی اس گھر کی دہلیز پر اپنے ناپاک قدم رکھنے کی‘ ہماری عزت نیلام کرکے بھاگ گئی تھی۔ اپنے عاشق کے ساتھ اب کیوں چلی آئی اپنا منحوس و بے حیا وجود لے کر‘ نکل یہاں سے۔“ چچی نے اسے لان میں آتے دیکھ کر واویلا شروع کردیا۔ دھم دھم کرکے اس کے قریب آئیں‘ چیختے چلاتے ہوئے ساتھ ہی اسے دونوں ہاتھوں سے پیٹنا شروع کردیا۔

”چچی جان! میری بات تو سنیں چچی جان میری بات...؟ ان کے چلتے ہاتھ‘ چلتی زبان نے اسے بولنے کا موقع نہ دیا۔

”شمو (ملازمہ) نے خود تجھے اپنی آنکھوں سے اس لڑکے کے ساتھ کار میں جاتے دیکھا۔ اس نے آکر اطلاع دی۔ اسی وقت سب ڈنڈے لے کر نکل گئے۔ مگر کہیں نہ نظر آئی وہ کار...“

”شمو نے جھوٹ بولا ہے آپ سے چچی! اس نے مجھ سے بھی...“

”اسے بدنام کررہی ہے‘ میں تو پہلے ہی کہتی تھی۔ بیٹی بھی ماں کی طرح کوئی نہ کوئی گل کھلائے گی‘ ماں کا

[illegible] گھر سے باہر گزار آئی ہے۔ پھر بھی کیسی معصوم و مسکین بن رہی ہے۔ نکل جا اس گھر میں آئندہ کبھی بھول کر بھی قدم رکھنے کی جرات نہیں کرنا۔“ ان کے تھپڑ اس کا منہ لال کرگئے تھے۔ اس کے ریشمی بال انہوں نے بری طرح نوچ کھسوٹے تھے۔ پھر باقاعدہ دھکے دے کر اسے گھر سے نکالا تھا۔ اس کی منتیں‘ آہیں‘ التجائیں سب بے اثر تھیں۔

”چچی جان! خدا کے لیے‘ مجھے امی کے پاس جانے دیں۔“ وہ گیٹ پکڑ کر سسکیوں کے دوران بولی۔

”وہ منحوس یہاں نہیں ہے۔ خیراتی اسپتال میں پڑی‘ موت کی گھڑیاں گن رہی ہے۔“ وہ اسے گھر سے باہر نکال کر جاچکی تھیں‘ چوکیدار نے ان کے حکم پر اندر سے گیٹ بند کرلیا تھا۔ ماں کے متعلق سن کر وہ اپنی تکلیف چچی کے ہاتھوں اٹھائی ذلت و اہانت سب بھول گئی۔ رحمت بابا جو سب دیکھ اور سن رہے تھے۔ انہوں نے اپنے کوارٹر میں لے جا کر اسے تسلی دی‘ پانی پلایا اور شمو کے متعلق بتایا کہ وہ دوسرے دن ہی ملازمت چھوڑ گئی ہے۔ اس کے ہاتھ کہیں سے لمبی رقم لگ گئی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی گاؤں جا کر اپنا گھر خریدے گی اور میاں کو پرچون کی دکان کھلوائے گی۔“ بابا کی بات نے ثابت کردیا تھا اس کی بے گناہی کا پکا ثبوت فرار ہوچکا تھا۔ وہ اس شخص کو بددعائیں دینے لگی۔ جس نے نہ معلوم کب شمو کو خرید لیا تھا۔

رحمت بابا کے ساتھ وہ اسپتال آگئی۔ زنانہ وارڈ میں بے ترتیب چارپائیوں کے درمیان ایک چارپائی پر میلے بستر پر انتہائی گندے حلیے میں بے خبر و مدہوش پڑی ماں کو دیکھ کر اس کے صبر و ضبط کی لگامیں چھوٹ گئیں۔ وہ ان پر جھک کر شدتوں سے رودی۔ ارد گرد چارپائیوں پر موجود بیمار خواتین اور ان کے ساتھ موجود عورتیں اس کی طرف متوجہ ہوگئیں۔ اس کا شدتوں سے رونا‘ ملگجے میلے کپڑے‘ ہاتھوں اور پاؤں میں مہندی کے نقش و نگار‘ پیشانی پر بندھی پٹی‘ خواتین کے مخصوص تجسس و بے چینی کو ہوا دے رہے تھے۔ وہ [illegible] اس وقت۔

”خاموش ہوجاؤ بیٹی! تم کون ہو؟ ان کی...؟ یہ تو کل صبح سے یہاں اس طرح پڑی ہیں کوئی نہ ان کے ساتھ آیا تھا اور نہ ملنے‘ ہم تو لاوارث سمجھ رہے تھے۔“ ایک درمیانی عمر کی عورت اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے شفقت سے گویا ہوئی اور اپنے پاس لکڑی کی بینچ پر بٹھا لیا۔

”میری امی ہیں یہ! یہ لاوارث نہیں ہیں۔“ لاوارث کا لفظ اس کے دل کو چیر گیا۔

”معاف کرنا بیٹی! اتنی نازک حالت میں کوئی اپنا اس طرح کسی کو نہیں چھوڑتا۔ اس لیے خیال آگیا تم کل سے کہاں تھیں؟“ وہ عورت اس کا بغور جائزہ لیتی ہوئی سرسری لہجے میں بولی‘ باقی عورتوں کی آنکھیں اور کان اس سمت لگ گئے تھے۔ اسے عورتوں کی اس صنف سے سخت چڑ تھی جو خوامخواہ دوسروں کے معاملوں میں دل چسپی رکھتی ہیں تاکہ ایک سن کر آگے دس لگائیں۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا بہانہ کرے‘ سچ بول کر تماشا نہیں بننا چاہتی تھی۔ اسی دم ڈاکٹر معائنہ کے لیے اندر آگئے تو وہ سب منتشر ہوگئیں۔ اس نے گہرا سانس لیا اور دل میں تہیہ کرلیا کہ وہ ان لوگوں سے کوئی واسطہ نہیں رکھے گی۔

♣ ---- ♣ ---- ♣

”ماما! کل سے آپ نے خود کو کمرے میں قید کرلیا ہے اور کچھ کھا پی نہیں رہی ہیں۔ اس طرح آپ کا شوگر لیول ڈاؤن ہوجائے گا‘ جس سے کڈنی پین ہونے لگے گا۔“ متفکر و پریشان معاذ اندر آکر ان سے مخاطب ہوا۔

”ہوجانے دو‘ بلکہ دعا مانگو مجھے موت آجائے۔“ وہ روہانسی آواز میں گویا ہوئیں۔

”ما... ما...! پلیز کیا کہہ رہی ہیں آپ...؟“ وہ تڑپ کر ان کی طرف بڑھا تھا۔

”مت ہاتھ لگاؤ مجھے؟ مجھے تمہیں دیکھ کر تکلیف ہورہی ہے۔ سسرال والوں نے رشتے داروں اور شوہر نے جتنے چرکے میرے دل پر لگائے‘ جتنی اذیت

و تکلیف میں نے سالہاسال برداشت کی‘ ان سب سے بڑھ کر تکلیف تم نے مجھے دی ہے معاذ! میرے شریف وباکردار بیٹے کا یہ کون سا روپ ہے؟ جس نے ایک لڑکی کو پامال کرڈالا ہے۔ اس سے جینے کا حق چھین لیا ہے‘ میں نے تمہیں محافظ بنایا تھا‘ تم لٹیرے بن گئے۔۔۔؟‘‘

’’ماما! پلیز آپ میرے کردار پر شک کرکے میری بے عزتی کررہی ہیں۔ انتقام میں بھی میں انسانیت واخلاقیات کی حدیں عبور نہیں کرتا۔‘‘ ماں کے احترام میں لہجہ دھیما تھا۔ مگر چہرہ دمک اٹھا تھا۔

’’ہونہہ‘ میں ماں ہوں‘ یقین کرلوں گی‘ مگر اس بچی کا یقین کون کرے گا؟‘‘ وہ بپھر اٹھیں۔

’’کوئی کرے یا نہ کرے‘ یہ آپ کا دردِ سر نہیں ہے ماما! کیوں آپ نے سوار کرلیا ہے اسے خود پر؟‘‘

’’اس لیے کہ ایک عورت کا دکھ‘ دوسری عورت ہی سمجھ سکتی ہے۔‘‘

’’پھر کیا چاہتی ہیں آپ؟ کیونکہ۔۔۔ میں سب دکھ برداشت کرسکتا ہوں مگر آپ کی معمولی سی تکلیف بھی مجھے بڑی تکلیف میں مبتلا کردیتی ہے۔ ساری رات میں بے چین رہا ہوں‘ حالانکہ میں سوچ رہا تھا برسوں بعد اپنا مشن مکمل کرکے مجھے سکون کی نیند آئے گی مگر۔۔۔‘‘

’’اگر میرا خیال ہے؟ واقعی مجھ سے محبت کرتے ہو؟ اور مجھے زندہ دیکھنا چاہتے ہو تو مجھے اس مظلوم لڑکی کے گھر لے چلو۔‘‘ انہوں نے گویا دھماکا کیا تھا۔

’’ماما۔۔۔ ماما! آپ سمجھ رہی ہیں کہ کیا کہہ رہی ہیں؟‘‘ اس کا دماغ گھوم کر رہ گیا۔

’’افسوس! اتنے بڑے صدمے کے باوجود میرا دماغ ابھی درست کام کررہا ہے۔‘‘ ان کے لہجے میں سرد مہری تھی۔

’’پلیز ماما! میرا مطلب یہ نہیں تھا۔۔۔ آپ۔۔۔ آپ غور تو کیجیے کس کے گھر جانے کا کہہ رہی ہیں؟‘‘

’’محض اس قابلِ افسوس لڑکی کے گھر‘ جس کی پاکیزگی وبے گناہی‘ عزت ووقار سے رہنے کا حق میرے بیٹے کے بزدلانہ انتقام نے چھین لیا ہے۔ دوسرا کوئی رشتہ مجھے یاد نہیں ہے اب۔‘‘

’’آپ وہاں نہیں جاسکتیں ماما! وہ دشمنوں کا گھر ہے‘ میری غیرت گوارا نہیں کرتی۔‘‘

’’ایک بے قصور‘ کمزور وبے بس لڑکی کو اغوا کرتے وقت تمہاری غیرت کہاں جاسوئی تھی؟‘‘

’’ماما۔۔۔ ماما۔۔۔ ماما! فار گاڈ سیک‘ آپ مجھے شرمندہ نہ کریں۔‘‘

’’تم میری پروا مت کرو‘ میں مروں یا جیوں تمہاری بلا سے۔‘‘ وہ ضدی وائل انداز میں بولیں۔

’’یہ آپ کا آخری فیصلہ ہے؟‘‘ اس کے مدمقابل ماں تھی‘ بہ مشکل وہ خود کو کنٹرول کررہا تھا۔

’’فیصلہ ایک بار ہی کرنے کی تربیت میں نے ہی تمہیں دی ہے۔‘‘ وہ قطعیت سے کہنے لگیں۔

’’اوکے‘ کیجیے اپنے فیصلے پر عمل درآمد‘ میں ساتھ نہیں جاؤں گا۔‘‘ وہ طوفان کی طرح کمرے سے نکلا تھا اور پھر راہ میں آنے والی ہر شے کرچیوں کی صورت میں بکھرتی چلی گئی تھی۔

♣ ——— ♣ ——— ♣

اس کی زندگی میں جو سیاہ آندھی آئی تھی۔ اس نے اس کے بخت کے علاوہ زیست کو بھی سیاہ کرکے تنہائیوں کے مہیب جنگلوں میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیا تھا۔ وہ ابھی اپنی بربادی کے دکھ سے بھی نہ سنبھل پائی تھی کہ ماں بھی تین دن موت وزندگی کی کشمکش میں‘ اس سے کچھ کہے بنا اسے دیکھے بنا زندگی سے ہار کر موت کو گلے لگاگئی اور وہ بت بنی ان کے بے جان سرد وجود کو دیکھتی رہی۔ اس نے انہیں کبھی مسکراتے نہیں دیکھا تھا۔ سنجیدگی‘ خاموشی‘ ٹھہرے پانی جیسا سکوت‘ ویرانوں میں پائے جانے والا جامد سناٹا ان کی ذات کا حصہ تھا۔ آنکھوں میں ان کی اس نے ہمیشہ نمی دیکھی تھی‘ جو کسی لمحے دور نہیں ہوتی تھی۔ جب وہ لیٹتی تو وہ نمی آنکھوں کے گوشوں سے نکل کر تکیے میں جذب ہونے لگتی۔ وہ اس سے بہت محبت کرتی تھیں۔ مگر اس کی تربیت انہوں نے بہت سخت گیری سے کی تھی۔ اسکول اور پھر کالج وہ ان کی نگرانی میں جاتی اور ان کی نگرانی میں آتی‘ جس کے لیے انہیں فیکٹری سے دو دو چکر کرنے پڑتے۔ مگر اپنی تھکن کی پروا نہیں کرتی تھیں۔ ان کے خوف سے اس نے کوئی سہیلی نہیں بنائی تھی کہ دوستی میں روابط بڑھتے ہیں جو انہیں کبھی پسند نہیں تھے۔ اس نے اپنی کورس کی کتابوں سے دوستی کرلی تھی۔ جس کے نتیجے میں وہ اسکول سے کالج تک فرسٹ پوزیشن لیتی رہی تھی۔ باپ کو اس نے نہیں دیکھا تھا‘ وہ اس کی پیدائش کے دو ماہ بعد دنیا سے رخصت ہوگیا تھا۔ انہوں نے اسے ماں باپ دونوں کی توجہ دی تھی۔ وہ بی اے کا اگزام دے کر فارغ ہوئی تھی‘ جب ایک رات ان پر فالج کا حملہ ہوا اور وہ بروقت طبی سہولت نہ ملنے کی باعث بالکل ہی لاچار ومعذور ہوگئی تھیں۔ وہ تولیہ فیکٹری میں سپروائزر کے طور پر کام کرتی تھیں۔ بہت محنت‘ لگن‘ دیانت داری سے وہ اپنے فرائض انجام دیتی تھیں اور مکمل باپردہ ہوکر گھر سے نکلتیں‘ فیکٹری میں بھی ان کا پردہ قائم رہتا۔ وہاں ان کی بہت عزت کی جاتی تھی پہلی وجہ تھی کہ ان کے پڑنے کے بعد گھر کے اور دوائیوں کے اخراجات کی ذمہ داری اس کے کندھوں پر آگئی تھی اور اس نے ان سے اجازت لے کر فیکٹری میں درخواست دے دی تھی‘ جہاں اس کی ماما کی شان دار کارکردگی کی بنا پر اسے‘ ماں کے عہدے پر ہی رکھ لیا گیا تھا اور اس نے چند ہفتوں میں ہی ثابت کردیا تھا کہ وہ ماں کی طرح ہی محنتی‘ مخلص اور اپنے کام سے پورا پورا انصاف کرنے والی تھی۔ شروع شروع میں چچی اور چچا نے بہت باتیں بنائی تھیں اس کی ملازمت پر یہ جانتے ہوئے بھی کہ کیوں نوکری کررہی ہے‘ اس نے بھی ماں کی طرح ان کی طرف سے کان بند کرلیے تھے۔ کچھ عرصہ پہلے ماں پر دوبارہ اٹیک ہوا تھا اور یہ اتنا شدید ہوا تھا کہ وہ ہوش وخرد سے اکثر بیگانہ رہنے لگی تھیں۔ ڈاکٹر نے مطلع کردیا تھا کہ اب جانبر ہونا ناممکن ہے۔ ان کی زندگی ہوا کی زد میں رکھے چراغ کی مانند ہے اور وہ چراغ بجھ گیا تھا۔ ساتھ اس کی زندگی میں بھی اندھیرا ہی اندھیرا پھیلا گیا تھا۔ دنیا دکھاوے کے لیے چچا اور چچی نے بھاوج کے دکھ میں آنسو بہائے تھے اور بھائی کے حصے کی جائیداد خاموشی سے ہڑپ کرگئے تھے۔ وہ ماں کے جنازے کے ساتھ گھر آگئی تھی۔ ان کے آخری سفر پر روانہ ہوتے ہی اسے بھی گھر سے نکال دیا گیا۔ یہ احساس کیے بغیر کہ وہ جوان وبے آسرا لڑکی کہاں جائے گی۔ رحمت بابا جو چچی کے پرانے ملازم تھے اپنے سرونٹ کوارٹر میں اسے لے آئے تھے۔ وہ اور ان کی بیوی ہمہ وقت اس کی دل جوئی میں لگے رہتے تھے مگر وہ جیسے زندہ رہنے کے تمام جذبے‘ تمام احساس کھو بیٹھی تھی۔ خاموش بیٹھی خلاؤں میں گھورتی رہتی۔

’’بابا صاحب! گھر والے کہاں گئے ہیں؟‘‘

رحمت بابا نے ہاتھ میں پکڑی تسبیح کے آخری دانے پڑھے اور تسبیح چوم کر کرتے کی جیب میں ڈالتے ہوئے‘ اس خوش پوش وخوبرو نوجوان کی طرف بغور دیکھا جو بہت شائستگی اور ادب سے ان سے مخاطب ہوا تھا۔ ساتھ اس کے ایک خاتون بھی تھیں۔ جو لائٹ بلیو ساڑھی میں ملبوس بہت پروقار اور ازحد اضطراب وبے چینی کا شکار لگ رہی تھیں۔

’’بیگم صاحبہ اور صاحب ملک سے باہر گئے ہیں۔ اب نہ معلوم کب آئیں۔‘‘

’’ان کی بیٹی! میرا مقصد ہے ان کے اور بھی بچے ہوں گے سب ساتھ گئے ہیں؟ وہ خاصی گھبرا گئی تھیں۔

’’بیگم صاحبہ کی صرف دو بیٹیاں ہیں دونوں ہی شادی شدہ ہیں۔ وہ اپنے سسرالوں میں ہیں۔‘‘

’’ماما! بھائی جان نے ایڈریس تو غلط نہیں دے دیا؟ محترمہ! قندیل صاحبہ کا گھر یہی ہے۔‘‘ وہ نوجوان جو عمیر تھا ماما سے سرگوشی کرنے کے بعد سامنے کھڑے سفید ریش بزرگ سے استفسار کرنے لگا۔

’’جی ہاں۔ وہ یہیں رہتی ہیں۔ لیکن آپ کون ہیں؟‘‘ رحمت بابا جو بہت غور سے ماما کی شکل دیکھ رہے تھے یکدم چونک کر بولے۔ ان کے لہجے میں عجیب سراسیمگی تھی۔

’’نہیں یہ نہیں پوچھئے بڑے میاں! ورنہ ڈنڈے کھانے کا امکان بڑھ جائے گا۔‘‘ وہ آہستگی سے بڑبڑایا۔

"کہاں ہے وہ؟ میں اس سے ملنا چاہتی ہوں۔" ماما اضطراب میں آگے بڑھی تھیں۔

"بیگم صاحبہ! آپ کا نام افتین تو نہیں ہے؟" بابا جو بہت غور سے انہیں دیکھ رہے تھے پوچھ بیٹھے۔

"جی۔۔۔ جی ہاں مگر آپ کو کیسے معلوم ہوا جب کہ میں آپ کو پہلی بار دیکھ رہی ہوں؟"

"جی وہ نورین بیٹی اکثر آپ کا ذکر کرتی تھیں کہ آپ ان کی شکل سے بہت ملتی ہیں اور آپ کو وہ بہت یاد کرتی تھیں۔" رحمت بابا کی بوڑھی آواز بھرا گئی تھی۔ افتین کو زمین و آسمان گھومتے ہوئے محسوس ہوئے بے شک نورین کا گھٹیا و شرمناک عمل انہیں بھی لوگوں خصوصاً سسرال کے لوگوں اور شوہر سہیل احمد کی نگاہوں میں ہمیشہ کے لیے گرا گیا تھا۔ نورین کی خطاؤں کا انہیں خمیازہ بھگتنا پڑا تھا۔ مگر جب زخم لگتا ہے تو درد بھی تب تک محسوس ہوتا ہے۔ پھر رفتہ رفتہ زخم مندمل ہو جاتا ہے درد کا احساس بھی ختم ہوتا جاتا ہے اور ایک وقت ایسا آتا ہے کہ زخم' درد' تکلیف ہر انسان فراموش کر بیٹھتا ہے۔ ان کے دل میں بھی ایک مدت گزرنے کے بعد تکلیف کی جگہ کسک نے لے لی تھی۔

"تھیں سے کیا مراد ہے آپ کی بابا؟ نورین کہاں گئی ہے؟" ان کا دل بند ہونے لگا۔

"وہاں بیگم صاحبہ! جہاں جلد یا بدیر ہم سب کو ایک دن جانا ہے۔" انہوں نے آسمان کی سمت انگلی اٹھائی ان کے اندر درد کی ایک آگ تھی جو سرتاپا پھیلتی چلی گئی۔ اس نے جو کچھ کیا' اس سے قطع نظر وہ اس کی ماں جائی تھی' خون کا ایک ایسا رشتہ جو مر کر بھی نہیں ٹوٹتا' انہیں محسوس نہیں ہوا کب ان کے آنسو بے اختیار ہو کر چہرے کو بھگونے لگے بدبختی کی انتہا تھی بہن کے آخری دیدار سے بھی وہ محروم رہی تھیں اور اس نے ایک بغاوت ایک غلطی' ایک پسند کو پانے کے جنون میں کیسی سزا پائی تھی کہ اس کے جنازے کو اپنوں کا کندھا بھی نصیب نہ ہوا تھا۔ جس شہر میں اس کے اپنے بھرے پڑے تھے اس شہر کے شہر خموشاں میں وہ کسی لاوارث' گمنام' بے شناخت مسافر کی طرح دفنا دی گئی تھی۔ کتنا عبرت ناک انجام تھا اس کی محبت اور بغاوت کا۔

رحمت بابا نے اس کی زندگی کی تمام کہانی انہیں سنا دی تھی۔ نورین نے جذبات کی پیچیدہ راہوں کا انتخاب کر کے خود کو مسلسل عذاب میں رکھا تھا یاور کو قتل کے کیس میں عمر قید کی سزا سنائی گئی۔ قندیل دو ماہ کی ہوئی تو جیل سے اس کی موت کی خبر آئی۔ ایک سپاہی کو ہلاک کر کے اس نے جیل سے فرار ہونے کی کوشش کی تھی اور اس طرح وہ پولیس کی گولیوں کا شکار ہو گیا۔ یاور کے بھائی اسے اور قندیل کو اپنی کوٹھی میں لے آئے کیونکہ یاور کا جائداد میں آدھا حصہ تھا۔ رشتے داروں کی باتوں کی وجہ سے وہ بیوہ بھاوج اور یتیم بھتیجی کو لے تو آئے مگر وہی سلوک کیا جو بے سہارا اور کمزور لوگوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ ایک کمرے اور چھوٹے سے صحن پر مشتمل کوارٹر انہیں دیا گیا تھا۔ نورین پہلے کی طرح ہی فیکٹری میں ملازمت کر رہی تھیں۔

"وہ بہت دکھی عورت تھیں۔ اتنی کم عمری میں ان کی طرح عبادت گزار' باپردہ اور نیک عورت میں نے اپنی طویل زندگی میں نہیں دیکھی بیگم صاحبہ! مجھ پر تو انہوں نے اتنا عظیم احسان کیا ہے کہ میں اس کا بدلہ اتار ہی نہیں سکتا۔ میری بیٹی ایک لڑکے کے چکر میں بہت باغی اور گستاخ ہو گئی تھی۔ اس کی ماں سمجھا بجھا کر پریشان ہو گئی۔ میں نے اسے پیار سے سمجھانا چاہا' مگر وہ کچھ سننے' ماننے کو تیار نہ تھی۔ شادی کے دن قریب آ رہے تھے اس کے ایک رات وہ ہمارے سونے کے بعد سمجھیں ہماری عزت کو نیلام کرنے گھر سے نکل گئی تھی۔ وہ تو بھلا ہو نورین بی بی کا جنہوں نے نہ معلوم کب سے اس پر نظر رکھی ہوئی تھی۔ انہوں نے اسے پکڑ لیا اور سمجھا بجھا کر ہمارے پاس لے آئیں۔ ان کی زبان میں عبادت گزاری اور اللہ کے خوف نے ایسی چاشنی اور تاثیر پیدا کر دی تھی کہ میری بیٹی نے توبہ کر لی' مجھ سے اور اپنی ماں سے معافی مانگی اور خوشی خوشی ہماری دعاؤں تلے اس گھر سے رخصت ہوئی تھی۔ اگر

نورین بیٹی میری بیٹی کو گمراہی سے بچا کر اچھے راستے کی نشاندہی نہ کرتیں تو ہم تو بدنامی سے مرچکے ہوتے۔ انہوں نے اپنی زندگی کا مقصد یہی بنالیا تھا۔ فیکٹری میں بھی بے شمار لڑکیوں کو سنوارا ہے انہوں نے۔“

♣ ——— ♣ ——— ♣

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے رسوائیوں کی پرفریب اندھیری راہوں پر چلنے والے لڑکھڑا کر گرتے ہیں گھائل روح و جسم لیے دوسرے لوگوں کے لیے مشعل راہ بن جاتے ہیں۔

رحمت بابا اپنے گاؤں جارہے تھے کیونکہ صاحب لوگ طویل عرصے کے لیے ملک سے باہر گئے تھے۔ تمام ملازموں کی چھٹی کردی گئی تھی۔ وہ اپنی تمام تکلیفیں وشکایتیں بھول کر بہن کی محبت میں ڈوب چکی تھیں۔ دوسرا بڑا بوجھ ان کے ضمیر پر بیٹے کے اس قابل مذمت عمل کا تھا جس کے نتیجے میں وہ لڑکی‘ جو ان کی بھانجی تھی‘ نورین کی بیٹی قندیل کا مستقبل وہ تاریک کرچکا تھا اور اب ماں کے وجود سے بھی وہ محروم ہوگئی تھی۔ وہ اسے سینے سے لگا کر ماضی کو فراموش کرکے اپنے گھر لے آئی تھیں۔ وہ جو تنہائی‘ رسوائی‘ درماندگی اور ماں کی ابدی جدائی کے دکھ سے نڈھال و بے جان ہورہی تھی۔ اچانک خالہ کا مہربان‘ اپنائیت ومحبت سے لبریز وجود دیکھ کر ان کے سینے میں منہ چھپا کر اپنی حماں بختی پر پھوٹ پھوٹ کر روئی تھی۔ یہ احساس ہی کتنا فرحت بخش جاں فزا تھا کہ اس کا بھی کوئی ہے؟ اس سے محبت کرنے والا‘ چاہنے والا‘ خیال رکھنے والا۔ ورنہ ماں کے سوا اس زندگی میں پہلے کتابیں رشتے رکھتی تھیں پھر فیکٹری کی جاب اس کی رشتے داربنی تھی۔

”قندیل بیٹی! اس گھر کو اپنا گھر سمجھنا‘ بالکل بھی غیریت برتنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ افسین بیگم نے پیار سے اس کے گال تھپتھپائے تھے۔ وہ ان کے طویل خوب صورت سے لان والے عالی شان گھر کو دیکھ کر مرعوبیت کے ساتھ ساتھ احساس کمتری کا شکار بھی ہوگئی تھی۔ وہ اسے خوب صورت کمرے میں خود چھوڑ کر تنہائی میں خوب رونا چاہتی تھیں۔ ”آرام کرو صبح میں تم سے بات کروں گی‘ ملازمہ کے ہاتھ دودھ بھیج رہی ہوں۔ وہ ضرور پی لینا۔“ وہ ہدایت دے کر اس کی پیشانی چوم کر چلی گئیں۔ وہ کمرے کی آرائش وزیبائش دیکھتی ہوئی اپنے کل اور آج پر غور کرنے لگی۔

افسین بیگم نے نورین کے انتقال کی خبر اور اس کی آپ بیتی خالہ صفیہ کو سنادی تھی۔ دونوں اس کی موت پر خاموشی سے آنسو بہارہی تھیں۔ افسین بیگم کی حالت ابتر تھی۔

”بیٹی! معاذ کے جذبات تم جانتی ہو‘ کتنا بدظن وبدخواہ ہے نورین کے معاملے میں بچپن کے واقعے کو کس طرح یاد رکھا ہے اس نے‘ اور دیکھ کس طرح ذہانت وچالاکی سے ان کی خبریں لیتا رہا۔ جو عین وقت پر اپنے انتقام کی قسم بھی پوری کرلی تھی۔ صرف یاور کے بارے میں نہ جان سکا کہ وہ بہت پہلے ہی اپنے انجام کو پہنچ چکا تھا اور شاید نورین کی فالج سے معذوری کا بھی اسے علم نہ رہا ہوگا ورنہ اس طرح حد سے نہ گزرتا۔ خیر‘ وہ تو تمہارے وہاں جانے کو پسند نہیں کررہا تھا اور اب اس کی بیٹی کو اس گھر میں کس طرح برداشت کرے گا؟ اس کا غصہ اور مزاج کی تیزی میں نے اب دیکھی ہے اور مجھے یہی فکر کھائے جارہی ہے اب کیا ہوگا؟“

خالہ کو انہوں نے تسلی دے کر کمرے میں بھیج دیا تھا۔ معاذ کی طرف سے انہیں بھی کسی اچھے ردعمل کی توقع ہرگز نہیں تھی۔ مگر انہیں اطمینان تھا۔ وہ ان کی محبت کے آگے سر ڈال دے گا‘ وہ لاکھ غصہ ور‘ ضدی‘ ہٹ دھرم سہی مگر یہ بھی حقیقت تھی۔ ان سے بے پناہ محبت کرتا تھا۔ عبادت کی حد تک۔ وہ اس کی منتظر تھیں۔ کیونکہ عمیر کو کہہ چکی تھیں قندیل کے متعلق معاذ کو آگاہ نہ کرے کیونکہ خبر سن کر اسے سیدھے یہیں آنا تھا۔ قندیل کو بھی انہوں نے بے خبر رکھا تھا۔ پہلے مرحلہ میں اس بپھرے طوفان کو اعتدال میں لانا تھا‘ قندیل کو قائل کرنا زیادہ مشکل نہ تھا ان حالات میں کہ وہ نورین کے ماضی سے واقف تھی۔

”پاپا!... ! جو میں نے سنا وہ درست ہے؟“ حسب

توقع وہ دندناتا ہوا سرخ چہرہ لہورنگ آنکھیں لیے اندر آیا تھا۔ اس کے انگ انگ سے جیسے شرارے نکل رہے تھے۔

”ہاں اس میں غلط ہونے والی کون سی بات ہے؟ اپنی ماں کے مرنے کے بعد وہ تنہا رہ گئی تھی۔ آپ کے جرم کا کچھ احتساب مجھے بھی ادا کرنا ہے۔ مجھ میں ابھی انسانیت مری نہیں زندہ ہے۔“

”انسانیت نہیں ماما! یوں کہیے بہن کی محبت زندہ ہے۔“ وہ جلتی لکڑی کی طرح چٹخا۔

”فی الحال ماضی دفن ہوچکا ہے اور میں گڑے مردے اکھیڑنا نہیں چاہتی آپ کو اپنا انتقام پورا کرنا تھا‘ سو کرچکے اب آپ کسی معاملے میں کوئی مداخلت نہیں کریں گے۔ قندیل سے آپ کا رویہ بالکل نارمل ہونا چاہیے۔ نورین طبعی موت مری ہے۔ اگر اس کی موت کی ذمے داری آپ کے اس گھٹیا فعل پر ہوتی تو میں کبھی آپ کو معاف نہیں کرتی۔ قندیل کے بارے میں میں اب کوئی بات نہیں سنوں گی۔“

”ماما! آپ خود سوچیے کس رشتے سے آپ لوگوں سے اسے متعارف کروائیں گی؟ اس کا اس گھر میں رہنے کا کوئی جواز نہیں ہے بہت معیوب و ناپسندیدہ رشتہ ہے اس گھر سے اس کا میں اسے یہاں رہنے نہیں دوں گا۔ جس کی ماں اس گھر کو رسوائیوں اور آہوں میں غرق کرکے چلی گئی تھی۔ اس لڑکی کی زندگی جہنم بنادوں گا میں... ورنہ اسے آپ خود یہاں سے نکال دیں۔“ اس کا لفظ لفظ شرارہ تھا۔

”ٹھیک ہے۔ پھر وہ اکیلی نہیں جائے گی میں بھی اس کے ساتھ جاؤں گی۔ یہ گھر تم نے بنوایا ہے۔ تمہارا پیسہ لگا ہے یہاں اس لیے تم حاکمیت جتا رہے ہو؟ ملکیت کا احساس ہے‘ ماں کا احترام بھی تمہارے دل سے نکل چکا ہے۔ میں بھی یہاں نہیں رہوں گی۔“ وہ بھیگے لہجے میں فیصلہ کن انداز میں بولیں۔ ان کا یہ انداز یہ لہجہ وہ کبھی برداشت نہیں کرپاتا تھا۔ اس نے ہاتھ سے اپنا سر پکڑتے ہوئے گہرا سانس لیا جیسے اپنے تنے ہوئے دہکتے اعصاب پر قابو پانے کی کوشش کررہا ہو۔ وہ دوسری مرتبہ اس کے لیے ذہنی اذیت کا باعث بنی تھیں۔

”آپ کو کوئی حق نہیں ماما! میری محبت‘ میرے جذبوں کو ارزاں کرنے کا۔“

”آپ نے جو میرے اختیارات پر اپنی مرضی کو فوقیت دے کر میری حیثیت کو ارزاں ترین کردیا ہے؟“

”یہ بات نہیں ہے ماما! آپ میری بات سمجھ نہیں پارہی ہیں۔“ جال میں دہاڑتے شیر جیسی حالت تھی اس کی۔

”ٹھیک ہے آپ کو اختیار ہے‘ آپ کا گھر ہے‘ جسے چاہیں رکھیں آپ یہاں مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“

وہ ہمیشہ کی طرح ان کی محبت کے آگے بے بس ہوگیا تھا۔ ”دیکھتا ہوں تم کس طرح رہتی ہو یہاں؟“ وہ تصور میں قندیل سے مخاطب ہوا تھا پھر برق رفتاری سے کمرے سے نکل گیا۔ یہ محسوس کیے بنا کہ دیوار سے لگے ایک وجود نے حیرانگی و نفرت سے اسے دور تک گھورا تھا۔

”قندیل... ؟ آ... آؤ بیٹی! کیا بات ہے؟ نیند نہیں آرہی ہے؟“ اسے اندر داخل ہوتے دیکھ کر وہ قصداً شرمندہ ہوگئی تھیں۔ اس کے چہرے کے تاثرات کچھ عجیب وغریب سے نافہم تھے۔

”آنٹی! وہ... ؟ وہ شخص کون ہے؟“ سب کچھ سننے کے باوجود وہ یقین نہ کرنا چاہ رہی تھی۔

”وہ معاذ ہے۔ میرا بڑا بیٹا! اور آپ کا مجرم...“ انہوں نے نگاہیں چرا کر شکستگی سے کہا۔

”آنٹی!“ وہ ان کے گلے لگ کر شدت سے رونے لگی۔ اس کا اغوا کرنا اور بار بار پوچھنے پر بھی نہ بتانا‘ مبہم و پیچیدہ گفتگو‘ اسے لمحے بھر میں ادراک ہوگیا۔ اپنی ماں کی نادانی اسے بھی پرخار راہ پر گھسیٹ لے گئی تھی۔ وہ اس شخص سے نفرت کرتی رہی تھی مگر اب خود شرمندگی محسوس کررہی تھی۔ وہ کس تنفر کراہت سے اس کی ماں کا ذکر کررہا تھا اور کس قطعیت سے اس کے یہاں رہنے پر معترض و متنفر تھا۔ اس کا دل یہاں رکنے

کے لیے لمحے بھر کو تیار نہ تھا۔ عزت نفس سے بڑھ کر کوئی شے عزیز نہیں ہوتی۔ اس نے فیصلہ کرلیا تھا بہت جلد یہاں سے چلی جائے گی' کسی ہاسٹل میں رہائش پذیر ہوجائے گی۔ جاب ابھی اس کی برقرار تھی۔ شادی کے باعث ایک ماہ کی چھٹی لی تھی کہ بعد میں اشرف صاحب کے رویے پر منحصر ہوگا کہ وہ اس کی ملازمت کرنے پر اعتراض کریں گے تو چھوڑ دے گی۔ اور اس کا وہ دانشمندانہ فیصلہ بہتر ثابت ہوا تھا کیوں کہ دوسری جگہ جلد نوکری ملنا ناممکن تھا۔

"معاذ ابھی اپنے حواسوں میں نہیں ہے بیٹی! تم اس کی بات کا خیال مت کرنا' میرے ہوتے ہوئے تمہیں کسی پریشانی کی ضرورت نہیں اور معاذ نے جو تمہارے ساتھ کیا اس کے لیے میں نے اسے معاف نہیں کیا ہے۔ وقت آنے پر اسے اس کا ازالہ کرنا پڑے گا۔ تم خیال نہیں کرنا بیٹی!"

♣ ------ ♣ ------ ♣

زندگی میں جمود طاری تھا۔ آنٹی کے بے حد منع کرنے کے باوجود اس نے فیکٹری جانا شروع کردیا تھا۔ آنٹی اس کے دلائل کے آگے خاموش ہوگئی تھیں۔ وہ صبح کی نکلی شام کو آتی تھی اور گھر کے کام میں ان کے منع کرنے کے باوجود لگ جاتی تھی۔ معاذ سے اس کا ابھی تک سامنا نہیں ہوا تھا۔ وہ دانستہ اس کی موجودگی میں کمرے سے باہر نہیں نکلتی تھی۔ وہ بھی شاید ایسی ہی احتیاط کرتا تھا جو اب تک سامنا نہیں ہوا تھا۔ گھر میں آنٹی اور عمیر کا رویہ بہت اچھا تھا۔ نانی صفیہ بھی اکثر اس کے پاس آ بیٹھتی تھیں۔ امی کی یاد اکثر اسے رلاتی رہتی تھی اور اکثر وہ بے چین سی ہوکر کمرے میں ٹہلنے لگتی۔

اسے یہاں آئے تین ہفتے گزر چکے تھے۔ رات کو وہ اکثر کمرے کے باہر کسی کے چلنے پھرنے کی آوازیں سنا کرتی' کبھی ایسا لگتا جیسے کسی کمرے کا دروازہ کھول کر بند کیا گیا ہو۔ کچھ دیر خاموشی چھا جاتی اس کے بعد وقفے وقفے سے ایسی ہی آوازیں آنے لگتیں۔ شروع شروع میں اس نے یہی سوچا کہ گھر کے لوگ ہی ہوں گے اور کسی سے دریافت کرنا اسے اچھا محسوس نہیں ہوا۔ پھر رفتہ رفتہ دروازہ کھلنے بند ہونے' چلنے پھرنے کی بھاری جوتوں کی آوازوں میں شدت آتی گئی۔ اب بعض اوقات ایسا لگتا جیسے کوئی اس کے کمرے کے باہر گھٹی گھٹی آواز میں قہقہے لگا رہا ہو۔

اور رات کو عجیب واقعہ ہوا' وہ نماز سے فارغ ہونے کے بعد سیپارہ پڑھنے بیٹھ گئی۔ اس سے فارغ ہونے کے بعد وہ بے خبر سوگئی تھی۔ ابھی اسے لیٹے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی۔ اسے لگا دروازہ کسی نے آہستگی سے ناک کیا ہو۔ وہ نیند میں ہونے کے باوجود چوکنا ہوگئی تھی۔ دستک پھر بہت آہستگی سے دوبارہ ہوئی تھی۔ وہ دوپٹا اوڑھتی ہوئی اٹھی اور دروازہ کھول دیا۔ اس کا خیال تھا آنٹی یا نانی ہوں گی' مگر باہر کوئی نہ تھا۔ راہداری سنسان پڑی تھی۔ اس نے نیند سے بوجھل آنکھیں کھول کر اچھی طرح چاروں طرف دیکھا مگر کوئی موجود نہ تھا۔ وہ چند لمحے کھڑی سوچتی رہی کہ دروازہ بجایا گیا تھا یا اسے نیند میں محسوس ہوا تھا۔ وہ دروازہ بند کرکے اندر آنا ہی چاہتی تھی کہ یکلخت اس کی نگاہ سامنے کمرے کی تاریکی میں کھڑکی سے جھانکتی دہشت ناک صورت پر پڑی۔ خوف در خوف کی کیفیت میں وہ جیسے سکتے کا شکار ہوگئی تھی۔ جن بھوت پر وہ یقین نہیں رکھتی تھی۔ پر اس وقت جو صورت اس کے سامنے تھی۔ وہ انسانی صورت تو ہرگز نہ تھی۔ بڑی بڑی سرخ آنکھیں' شعلے کی مانند چمکتی لمبی زبان بڑے بڑے خوف ناک دانتوں کی قطار' ناک کی جگہ دو سیاہ گڑھے پورا چہرہ لمبے بالوں سے ڈھکا تھا۔ اسے اپنی جانب دیکھتا پاکر ان بھیانک دانتوں کے درمیان سے گھٹا گھٹا قہقہہ برآمد ہوا۔ قہقہے کی آواز سنتے ہی اس کا سکتہ جیسے ٹوٹا تھا۔ اس سفید لبادے میں بھی ہلچل ہوئی تھی قبل اس کے وہ اس تک پہنچتا اس نے اپنے ڈرتے کانپتے وجود کو بمشکل اندر گھسیٹا تھا اور دروازہ لاک کرتے ہی خوف سے بے ہوش ہوکر گر گئی تھی۔ اس کی آنکھ کھلی تو باہر سے دروازہ متواتر بجایا جارہا تھا۔ اس نے متوحش نگاہوں سے دروازے کی سمت دیکھا۔ رات کا واقعہ اس کی ذہن کی اسکرین پر چلے تھا۔ خوف و دہشت سے وہ ابھی بھی لرزاں تھی۔ باہر سے دروازہ پیٹنے کے ساتھ نانی جان کی آواز بھی آئی تو اس نے سرعت سے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔

"خیریت تو ہے نا بیٹی؟ کب سے دروازہ بجارہی ہوں۔" وہ اندر آتی ہوئی گویا ہوئیں۔ "ارے آج فیکٹری نہیں جانا کیا؟" اسے رات کے حلیے میں دیکھ کر وہ حیرانگی سے استفسار کرنے لگیں کیوں کہ صبح ناشتا وہ اس کے ساتھ ہی کرتی تھیں۔ پھر دس بجے نورین اور عمیر معاذ کے ساتھ دوسری شفٹ لگاتیں۔

"جسم میں درد اور سستی محسوس ہورہی ہے۔ سوچ رہی ہوں چھٹی کرلوں؟"

"ہاں۔ کرلو مجھے بھی تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی۔" وہ اس کے اترے اترے زرد چہرے کو دیکھ کر بولیں۔

"نانی جان! آپ نانا جان کو کیا کہہ کر مخاطب کرتی تھیں؟ جان! جانو! یا دلبر جانی؟" عمیر نے ان کو نزدیک بیٹھتے ہوئے نہایت بھولپن سے کہا۔ جبکہ قریب بیٹھیں گاجر کے حلوے کے لیے گاجریں صاف کرتی ہوئی افسین بیگم اور قندیل مسکرا اٹھی تھیں۔

"ارے افسین بیٹی! تمہارا یہ لونڈا تو بالکل ہی بے حیا ہے۔ لو بھلا مجھ سے ایسے سوال پوچھتا ہے جو کبھی میری سہیلیوں نے بھی مارے لاج کے نہیں پوچھے۔" نانی جان مارے لجاجت کے سرخ پڑ گئیں۔

"نانی پلیز! شرمایئے نہیں' آپ کو نانا کی قسم' بتایئے نا۔" وہ چھیلی ہوئی گاجر اٹھا کر کھاتا ہوا بولا۔

"لڑکے باؤلا ہوگیا ہے تو! لو بھلا کیا بولوں گی' کبھی راشد کے ابا' یا زرینہ کے ابا کہہ دیا کرتی تھی۔"

"اور جب کیا کہتی تھیں؟ جب کوئی ابا کہنے والا دنیا میں نہیں آیا تھا؟"

"غضب خدا کا آج کل کے لڑکوں کو ذرا بھی شرم نہیں ہے۔ اچھا بتاتی ہوں' مجھے معلوم ہے جب تک پوچھ نہیں لوگے چین نہیں لینے دوگے۔ وہ شادی کے شروع شروع کے دن تھے۔ تمہارے نانا کے کسی دوست نے ہماری دعوت کی۔" نانی جان کے چہرے پر ماضی کے خوب صورت رنگ دمکنے لگے۔ "ہم دونوں گئے ان کے دوست کے گھر والوں نے بہت آؤ بھگت کی میری نندوں نے مجھے بالکل دلہن کی طرح سجا سنوار کر بھیجا تھا۔ دلہن دیکھنے کے شوق میں وہاں بہت سارے بچوں نے مجھے گھیر لیا۔ میزبان عورتیں بھی خاطر مدارات کے بعد اپنے اپنے کاموں میں لگ گئیں۔ کیوں کہ وقت بہت ہوگیا تھا۔ تمہارے نانا نے باہر مردانہ بیٹھک سے کوئی پیغام نہیں بھیجا کہ کب چلنا ہے؟ وہ باہر دوستوں میں مگن تھے۔ گھر کی خواتین مجھے بھول کر کاموں میں مصروف ہوگئی تھیں۔ شام ڈھلنے لگی تو میں نے ایک چھوٹی بچی سے کہا۔ باہر اپنے بھائی سے بولو اندر دلہن بلا رہی ہے کیوں کہ تمہارے نانا نے آتے وقت اس بچی کو پیار کیا تھا۔ چند لمحے بعد وہ بچی بھاگتی ہوئی آئی اور بولی۔ بھائی دروازے کے باہر کھڑے ہیں۔ میں غرارہ سنبھالتی اٹھی اور دروازے پر پڑا پردہ اٹھا کر دیکھا تو کوئی سیاہ رنگت اور لمبی مونچھوں والا آدمی حیران و پریشان کھڑا تھا۔ اس پر نظر پڑتے ہی میں الٹے پاؤں اندر کو ہوئی۔ اس بچی سے پوچھا وہ کس کو بلا لائی ہے تو بولی۔ "آپ نے کہا تھا اپنے بھائی کو بلا لاؤ میں اپنے بھائی کو بلا لائی۔" مارے شرمندگی کے میرا برا حال تھا۔ کیوں کہ اپنی نندوں سے ایسے ہی بولتی تھی۔ وہ آدمی سمجھ گیا تھا۔ اس نے تمہارے نانا کو بھیج دیا اور وہ اتنا برہم ہوئے کہ پوچھ نہیں اور آیندہ میں نے بھی ان کے ساتھ جانے سے توبہ کرلی۔" نانی کے لبوں پر دھیمی مسکراہٹ تھی۔ عمیر نے بے ساختہ قہقہہ لگایا تھا۔ قندیل اور افسین بیگم مسکرانے لگیں۔

"قندیل! کبھی تو ہنس دیا کرو بہت کنجوس ہو اس معاملے میں۔" وہ اسے ساتھ لے کر لان میں آگیا تھا۔

جاتی گرمی' آتی سردی کی یہ شام بہت سہانی تھی۔ دھیمی دھیمی چلتی ہوا اس کے بالوں کو بکھیرتی اچھی لگ رہی تھی۔ عمیر نے اسے کھلے دل سے ویلکم کہا تھا اور بہت پرخلوص انداز میں اس کا دھیان رکھتا تھا۔ کبھی محسوس ہی نہیں ہوا یہ اس ظالم' سفاک' وحشی کا بھائی

ہے۔

”عمیر! وہ سامنے جو کمرا ہے وہ کس کا کمرا ہے؟“ اس نے اوپر رنگ برنگی پھولوں والی بیلوں سے لدے کمرے کی طرف اشارہ کیا جہاں رات کو اس نے بھیانک ترین مخلوق دیکھی تھی۔

”وہ کمرا؟ راحیل چچا کا تھا اور اسی کمرے میں انہوں نے خودکشی کی تھی۔ ماما اس کمرے میں کسی کو نہیں جانے دیتیں۔ انہیں کچھ وہم سے ہیں۔ ہفتے میں اس کی صفائی ہوتی ہے پھر کمرا بند رہتا ہے۔“ عمیر بہت سنجیدگی سے بتا رہا تھا اور اس کی سماعت میں رات کو متعدد بار دروازہ کھلنے‘ بند ہونے‘ بھاری جوتوں سمیت کسی کی چہل قدمی‘ گھٹے گھٹے قہقہے اس کے کمرے کے دروازے پر دستکیں۔ اسے اپنا سانس بند ہوتا محسوس ہوا۔ وہ کمرا اس کے سامنے والی رو میں بنا تھا اور اس کے دائیں بائیں آنٹی اور نانی جان کے کمرے تھے۔ وہ بری طرح دھڑکتے دل کو پکڑ کے نیچے گھاس پر بیٹھ گئی۔

”تھک گئیں؟“ اس کی حالت سے بے خبر عمیر بھی اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔

”تم کالج نہیں گئے آج؟“ معاذ نہ معلوم لان کے کس گوشے سے برآمد ہوا تھا۔

”وہ... وہ بھائی جانی! آج موڈ نہیں بنا۔“ معاذ کے کڑے تیور اسے حسب عادت گڑبڑا گئے۔

”آیندہ ایسی بے قاعدگی برداشت نہیں کروں گا۔ چلو اپنے کمرے میں جاؤ۔“ وہ خاصا ڈپٹ کر سرد لہجے میں بولا تھا۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے وہ نرسری میں پڑھنے والا ’معصوم‘ چھوٹا بچہ ہو۔ عمیر بہت سعادت مندی سے سر جھکا کر اندر کی جانب بڑھ گیا تھا۔ قندیل نے بھی اندر جانے کے لیے قدم بڑھائے تھے۔

”آپ فیکٹری کس کی اجازت سے جا رہی ہیں؟“ وہ قدم بڑھا کر اس کے آگے استادہ ہو گیا تھا۔

”یہ میرا ذاتی معاملہ ہے جس کے لیے میں کسی کی اجازت کی پابند نہیں ہوں۔“ وہ بھی اسی کے لہجے میں بولی۔

”آپ بھول رہی ہیں آپ اپنی مرضی کی پابند اپنے گھر میں ہو سکتی ہیں۔ فی الحال آپ میرے گھر میں براجمان ہیں اور یہاں آپ ایسا کوئی کام نہیں کریں گی جس سے میری عزت پر حرف آنے کا اندیشہ ہو۔“ الفاظ سے زیادہ اس کا لہجہ اہانت آمیز تھا۔

”میں یہاں زبردستی نہیں آئی آنٹی لائی ہیں۔ اور میرا یہاں پر مستقل رہنے کا ارادہ نہیں ہے جب مجھے جگہ مل جائے گی۔ چلی جاؤں گی۔“ اس کی کم ظرفی و تذلیل اس کا پور پور سلگا گئی۔

”ریلی؟“ اس کا تحقیرانہ انداز طنز و حقارت سے بوجھل تھا۔ اس نے پہلی بار اسے بغور دیکھا تھا سیاہ کاٹن کے سوٹ پر زرد و سیاہ پرنٹڈ دوپٹے کے ہالے میں اس کا سرخ چہرہ خاصا دلکش و جاذب نظر تھا۔ وہ غصے میں اندر چلی گئی تھی۔ معاذ کے لبوں پر آسودہ سی مسکراہٹ چمک کر معدوم ہو گئی تھی۔ وہ اس کے گھر میں آمد کے بعد سے زیادہ تر کاروباری معاملات کے باعث باہر ہی رہتا اور گھر میں آنے کے بعد زیادہ تر اپنے کمرے میں ہوتا تھا۔ اس گریز کے باعث اسے معلوم ہی نہ ہو سکا کہ قندیل فیکٹری جا رہی ہے۔ کل دوپہر کو ایک دوست کے پاس فیکٹری ایریا گیا تو وہاں سے واپسی پر قندیل اسے ایک فیکٹری سے نکلتی نظر آئی۔ اس نے اپنے ذرائع سے معلوم کر لیا کہ وہ وہاں سپروائزر کے طور پر کام کرتی ہے۔ یہ بات اس کی طبیعت پر گراں گزری تھی۔

اس کا لیدر کا بزنس بہت وسیع تھا۔ ملک کے اعلیٰ کاروباری فیملز میں سے ایک تھا۔ اس کے گھر کی رہائش پذیر لڑکی ایک معمولی سی جاب کر رہی تھی۔ وہ بھی اس کے گھر میں رہ کر۔ اس سے بات کرنے کے خیال سے ہی وہ آج جلدی آگیا تھا۔ اتفاقاً وہ بھی عمیر کے ساتھ لان میں بیٹھی نظر آگئی اور وہ سیدھا وہیں چلا آیا تھا۔

♣ ——— ♣ ——— ♣

”سچ کہہ رہی ہو بیٹی!“ نانی جان خوف کے مارے کپکپا اٹھیں تھی۔ قندیل نے تنہا پا کر انہیں وہ تمام پراسرار واقعات سنا ڈالے تھے جس میں وہ رات کا بھیانک ترین واقعہ بھی تھا۔

”نانی جان! بالکل سچ کہہ رہی ہوں۔ میں نے کسی سے بھی ذکر نہیں کیا کہ کوئی یہ سمجھے یہاں رہ بھی رہی ہے اور باتیں بھی بنا رہی ہے۔ مجھے رات سے بہت ڈر لگ رہا ہے۔“ وہ ان کے قریب خوف زدہ بیٹھی تھی۔

”ڈر تو مجھے بھی لگ رہا ہے بیٹی! شاید وہ راحیل کی روح ہے۔ افسین بتا رہی تھی مرنے سے پہلے وہ کچھ پاگل ہو گیا تھا۔ خواہ مخواہ قہقہے لگانے لگتا‘ تنہا باتیں کرتا تھا۔ پھر بلا مقصد کمرے کے چکر لگاتا رہتا تھا۔ اب کیا ہوگا؟ مجھے بھی ڈر لگ رہا ہے۔ سنا ہے روح کا انتقام بہت برا ہوتا ہے۔ بیٹی! میری مانو تو تم اپنا کہیں الگ ٹھکانا کر لو۔ اگر میری بہوئیں اس قابل ہوتیں تو میں تمہیں اپنے ساتھ لے جاتی مگر وہ میرا وجود برداشت کرنے کو تیار نہیں ہے۔ میں بڑھاپے میں ادھر ادھر وقت گزارتی ہوں۔ وہ تمہیں کس طرح برداشت کریں گی۔“ ان کے لہجے میں اس عمر میں بیٹوں اور بہوؤں کی بے مروتی و بے حسی بول رہی تھی۔

وہ رات اس نے ان کے کمرے میں ہی گزاری۔ نانی جان جب تک جاگتی رہیں خوف زدہ رہیں۔ ان کا خیال تھا راحیل کا بھوت اس کے پیچھے لگا ہے۔ کیوں کہ وہ نورین کی بیٹی ہے اور راحیل نے نورین کی وجہ سے خودکشی کی تھی۔ اب وہ اپنا انتقام اس سے لینا چاہتا تھا اور روح کے انتقام کے کئی ڈراؤنے واقعات انہیں یاد آرہے تھے۔ جنہیں سنا سنا کر ڈر رہی تھیں اور ڈرا ڈرا کر سنا رہی تھیں۔ پھر وہ سو گئیں اور ان کے بے ہنگم خراٹے پورے کمرے میں بکھرنے لگے۔ قندیل خوف سے سہمی ہوئی ان کے قریب ہی لیٹی رہی تھی۔

صبح ناشتا کر کے سب کے بہت روکنے کے باوجود وہ ڈرائیور کے ہمراہ اپنے بڑے بیٹے کے ہاں نیو ٹاؤن چلی گئی تھیں۔ قندیل کے علاوہ وہ سب ہی حیران تھے ان کے اس طرح اچانک چلے جانے سے۔

”ایسی بھی کیا اچانک پوتے پوتیوں کی یاد آئی کہ جھٹ پٹ چلی گئیں۔“ افسین بیگم کی حیرانگی حد سے سوا تھی۔

”آپ پریشان مت ہوں ماما! میں کل جا کر لے آؤں گا۔“ معاذ بخوبی جانتا تھا وہ خالہ کو ماں کی طرح چاہتی ہیں اور انہیں اپنے یہاں ہی رکھ کر خوش ہوتی تھیں۔ ماما کو افسردہ دیکھ کر وہ بے چینی سے بولا۔

”آنٹی! یہ رکھ لیں۔“ قندیل جو ابھی فیکٹری سے آئی تھی‘ آج اسے تنخواہ ملی تھی۔ اس نے ہزار کا نوٹ اپنے اخراجات کے لیے رکھا اور دوسرے ہزار کے نوٹ ان کے پاس ٹیبل پر رکھ دیے۔

”یہ کیا ہے بیٹی!“ انہوں نے حیرانگی سے ایک نظر نوٹ پر ڈالی‘ پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے قریب بٹھا لیا۔ جبکہ سامنے سنگل صوفے پر براجمان معاذ کی نگاہیں اس کے چہرے پر تھیں۔

”آنٹی! یہ کرایہ ہے۔ آپ مجھے ساتھ لے آئیں اور میں نہ چاہتے بھی آپ کے ساتھ اس لیے آگئی کہ پے در پے صدمات سے سنبھل نہیں پائی تھی اور اتنی جلدی میں اپنے لیے رہائش بھی کہیں نہیں دیکھ سکتی تھی۔ آپ کے ساتھ آتے ہوئے میں نے یہی فیصلہ کیا تھا کہ آپ کے یہاں رہنے کا میں معاوضہ دوں گی۔ اس بات کا مجھے احساس ہے کہ اس گھر سے میرا رشتہ ماں کے حوالے سے بہت معیوب اور نازیبا ہے جو مجھے ناگوار و ناپسندیدہ لگتا ہے۔ مجھے یہاں رہنا اچھا نہیں لگتا۔ آپ آنے والے لوگوں سے میرا تعارف دور کی مرحوم عزیزہ کی بیٹی کہہ کر کرواتی ہیں۔ اس لمحے آپ کی آنکھوں میں آنے والی نمی میرے دل میں گھاؤ ڈال دیتی ہے۔ مستزاد ان لوگوں کی نگاہوں کے بے یقینی چھلکاتے بہت کچھ سمجھ جانے والے تاثرات مجھ سے برداشت نہیں ہوتے آنٹی! بندہ بے شمار گناہ کرے پھر صدق دل سے اللہ سے گناہوں کی معافی مانگ لیتا ہے تو وہ رب معاف کر دیتا ہے مگر بندوں کو کبھی نادانی میں کسی کے گناہ کے بارے میں علم ہو جائے تو وہ بندے معاف نہیں کرتے۔ اور بدقسمتی سے میری ماں ایسے ہی گناہ کی مرتکب ہوئی تھی۔ اتنے بہترین سسرال اور آرام و آسائش چھوڑ کر وہ خود تو تباہ ہوئیں اور ساتھ کتنے ہی اپنوں کو تباہ کر ڈالا۔ آخری سانس تک انہوں نے اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کیا ہے۔ میں یہاں رہوں گی تو آپ

کے لیے بھی کسک کا باعث بنوں گی اور لوگوں کی آنکھیں جو کہتی ہیں کل کو زبان بھی بولنے لگے گی اور میں۔۔۔ میں نہیں چاہتی جو داستان امی کے ساتھ دفن ہوگئی دوبارہ زندہ کی جائے اور ان کی روح کو نئے سرے سے اذیت پہنچے۔ ان پیسوں کو آپ معاوضہ یا کرایہ سمجھ کر رکھ لیں۔ میں نے ہاسٹل میں ایک کمرا لے لیا ہے۔ کل سے میں وہاں شفٹ ہوجاؤں گی۔ پلیز انکار مت کیجیے گا۔" متواتر بولتے بولتے اس کی آواز بھرا گئی تھی۔ اس نے پلکوں تک آئی نمی کو چھپانے کے لیے چہرہ جھکالیا۔ وہ بہت خوددار' حساس لڑکی تھی۔ معاذ لمحے بھر کو اپنے گھٹیا طرز عمل اور بداخلاق رویے پر نادم سا ہوگیا تھا۔ اس کا ذہن جو ماں کے علاوہ ہر عورت کا عکس دھندلا گیا تھا۔ وہ دنیا کی ہر عورت کو بے وفا' ہرجائی' موقع پرست سمجھتا تھا۔ اس نے تعلیمی مراحل کے دوران کبھی کسی لڑکی کو لفٹ نہیں دی تھی اپنے اکھڑپن' سرد مہری و خشک مزاجی کے باوجود وہ لڑکیوں میں خاصا مقبول رہا تھا۔ بزنس میں قدم جمانے کے بعد اس نے اپنی فیکٹریز و کارخانوں میں صرف مرد حضرات کو ملازمتیں دی تھیں۔ اس کے آفس میں بھی تمام مرد حضرات ہی تھے۔ سیکرٹری کے طور پر بھی اس نے خاتون کو رکھنا گوارا نہیں کیا تھا۔ چچی کی بدکرداری اور چچا کی خودکشی نے اس کے دل میں زہر ہی زہر بھر دیا تھا۔

چچا کا انتقام لینے اور دادی سے کیے گئے عہد کو پورا کرنے کے لیے اسے بھرپور جدوجہد کرنی پڑی تھی۔ چچی کی رہائش گاہ کا پتا اسے چچا کی ڈائری سے مل گیا تھا۔ اس نے اس بوسیدہ اور گندے سے علاقے میں واقع اس گھر کے بے شمار چکر لگائے تھے۔ ہردم اسے وہاں تالا منہ چڑاتا ملا تھا مگر وہ فولادی اعصاب و مضبوط قوت ارادی کا مالک تھا۔ وہ کئی سال تک وہاں چکر لگاتا رہا اور پھر ایک دن اسے دروازہ کھلا مل گیا۔ اس کو وہاں ایک بوڑھا ملا تھا جس نے بتایا کہ وہ اس گھر کا مالک ہے۔ یاور کے بارے میں وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ کہاں ہے البتہ اس کی شخصیت اور بڑی ساری کار سے مرعوب ہوکر یاور کے بھائی کے گھر کا پتا دے دیا۔ اسے مطلوبہ گھر ڈھونڈنے میں پریشانی نہیں ہوئی۔ اس نے وہاں ایک ملازمہ سے تمام معلومات لے لی تھیں۔ ملازمہ نے بتایا کہ یاور کی بیٹی قندیل کی شادی سے کل اشرف صاحب سے۔ یوں وہ ملازمہ کو پچاس ہزار کے عوض خرید چکا تھا اور ملازمہ نے اس کی مشکل آسان بنا ڈالی تھی۔

"قندیل! یہ کیسے سوچ لیا آپ نے' میں آپ سے پیسے لوں گی؟" وہ خفگی سے بولیں۔

"قابل اعتراض بات نہیں ہے آنٹی! وہاں رہتے تھے تو چچی کو بھی ہزار روپیہ ماہوار دیتی تھی۔ یوں تو سگا رشتہ تھا' میرے باپ کا گھر تھا وہ آپ سے ایسا کوئی رشتہ نہیں ہے۔"

"ایسے نہیں کہو قندیل! نورین سے رشتہ دیورانی ہونے کا ختم ہوا تھا۔ بہن کا تعلق آج بھی قائم ہے۔ بہن کو کھودیا میں نے اب اس کی نشانی کو کھونے کی ہمت نہیں ہے مجھ میں۔ آئندہ ایسا کبھی مت کہنا۔" وہ اسے سینے سے لگا کر رو دیں۔ معاذ نے بے چینی سے پہلو بدلا تھا۔

"ماما! یہ اگر جانا چاہ رہی ہیں تو آپ جانے دیں۔ میرے خیال میں یہ درست کہہ رہی ہیں۔"

"معاذ! میرے زخموں پر نمک مت چھڑکو اگر مرہم نہ رکھ سکو تو۔"

"مجھے ایسا لگ رہا ہے ماما! جیسے آپ نے میرے خلاف محاذ قائم کرلیا ہے۔ میرے ہر عمل پر آپ نے اختلاف برائے اختلاف' مخالفت برائے مخالفت کی پالیسی اپنا رکھی ہے۔ سوچتی نہیں ہیں آپ!" وہ خفا خفا ناراض سا وہاں سے اٹھ کر چلا گیا۔ قندیل سن سی بیٹھی رہ گئی۔

معاذ کی نفرت پہلے دن سے ہی اس پر عیاں ہوگئی تھی۔ حسب پروگرام وہ دوسرے دن وہاں سے جانہ پائی۔ آنٹی کا بلڈ پریشر شوٹ کرگیا تھا۔ انہیں شعبہ انتہائی نگہداشت میں رکھا گیا تھا اور وہ تیسرے دن صبح ہوش میں آئی تھیں۔ آنکھ کھولتے ہی انہوں نے قندیل کو پکارا تھا۔

"مجھے چھوڑ کر تو نہیں جاؤ گی نا؟" اس کا ہاتھ پکڑ کر وہ آنسوؤں کے دوران بولی تھیں۔ اس نے بے اختیار نفی میں گردن میں ہلادی تھی۔ ان کے چہرے پر اطمینان سا چھا گیا تھا۔ پھر انہوں نے دائیں بائیں کھڑے عمیر اور معاذ کو پیار کیا تھا۔ عمیر اس عرصے میں گم صم ہوکر رہ گیا تھا۔ جبکہ معاذ کو اس نے پہلی مرتبہ پریشان و بدحواس دیکھا تھا۔ وہ ایک لمحے کے لیے سکون سے نہیں بیٹھا تھا۔ اس عرصے میں اس کی بے چینی' پریشانی' اضطراب ماں سے محبت کا بے مثال ثبوت تھا۔ ڈاکٹر نے کہا تھا کسی گہرے صدمے کی وجہ سے آنٹی کا بلڈ پریشر شوٹ کرگیا تھا جو ہارٹ کے لیے نقصان دہ ہوسکتا تھا۔

"تمہاری وجہ سے ماما شدید تکلیف میں ہیں اگر انہیں کچھ ہوگیا تو سمجھ لینا تمہاری زندگی کی گھڑیاں بھی پوری ہوچکی ہوں گی۔" اس نے انگارے برساتے ہوئے شعلے اگلتی آنکھیں اس کے روئے روئے پریشان چہرے پر ڈالتے ہوئے وارننگ دی تھی۔

آنٹی گھر پر آگئی تھیں اسپتال سے بلڈ پریشر ان کا نارمل ہوا تو شوگر ہائی ہوگئی اور وہ ان کے ساتھ سائے کی طرح رہنے لگی۔ ان کی دوا' غذا' آرام کا خیال پوری طرح رکھنے لگی۔ ان کے بستر پر پڑتے ہی پورے گھر کی ذمے داری اس پر آگئی تھی۔ ہر کام کے لیے ملازم تھے اور انھوں نے آنٹی کی تنہائی و بیماری سے فائدہ اٹھا کر ہر جگہ بے ترتیبی پھیلائی ہوئی تھی۔ اس نے ان کے سر پر سوار ہوکر صفائیاں کروائیں۔ سٹنگ تمام کمروں کی بدلوائی (ماسوائے راحیل اور معاذ کے کمروں کے) گھر بالکل نیا نیا لش پش کرنے لگا تھا۔ آنٹی نے اسے بہت ساری دعاؤں سے نوازا تھا۔ عمیر اور زیادہ اس کا گرویدہ ہوگیا تھا۔ کالج سے آنے کے بعد اس کا وقت اس کے ساتھ گزرتا شام کو وہ اپنے دوستوں کے ساتھ کرکٹ کھیلنے چلا جاتا تھا۔ معاذ اور اس کے درمیان بیگانگی و خاموشی کی وہی دیوار کھڑی تھی جو اول روز سے دونوں نے خود قائم کی تھی۔ البتہ اس نے اب اس کی موجودگی میں کمرے میں بند رہنا چھوڑ دیا تھا۔ ناشتا اور رات کے کھانے پر ساتھ بیٹھتا تھا اور کھانے کے دوران عمیر کی تعلیمی سرگرمیوں کی رپورٹ باقاعدگی سے لیتا تھا۔ آنٹی کی طبیعت ناساز ہونے کے باعث اس نے فیکٹری سے دو ہفتوں کی چھٹی لی تھی جو آج ختم ہوگئی تھی۔ آنٹی کی طبیعت پہلے سے بہتر تھی لیکن ابھی کمزوری بہت تھی ان میں۔ وہ انہیں چھوڑ کر نہیں جاسکتی تھی۔ اس نے مزید ایک ہفتے کی چھٹی لینے کا ارادہ کیا اور فون کے ذریعے سر کو مطلع کرنے لگی۔ اس کی چھٹی کے جواب میں وہاں سے جواب ملا اس کی ہمیشہ کے لیے چھٹی کردی گئی ہے۔ وہ یہاں آنے کی زحمت نہ کرے۔ کیوں کہ اس کی سیٹ پر نئی سپروائزر تعینات ہوچکی تھی۔ دوسری طرف سے گویا دھماکا ہوا تھا۔ اسے اپنی سماعت پر یقین نہ آیا۔ اس کے پاس بہت اچھے تھے اسی کی وجہ سے اور پھر اس کی بہترین کارکردگی کی بنا پر وہ اس کی بہت عزت کرتے تھے۔ دوسری ورکرز کے مقابل اسے زیادہ مراعات حاصل تھیں وہاں اب انہوں نے ہی کتنی بے مروتی و بدلحاظی سے کہہ دیا تھا کہ اس کی وہاں ضرورت نہیں ہے۔

"یکسکیوزمی! ریسور رکھ دیجیے۔ دوسری طرف سے کال آف ہوچکی ہے۔" وہ جو دکھ و صدمے کے زیر اثر ریسیور کان سے لگائے کھڑی تھی معاً گمبھیر و سنجیدہ آواز پر چونک کے نگاہیں اٹھائیں وہ فون اسٹینڈ کے قریب رکھے صوفے پر بیٹھا اس کی سمت ہی دیکھ رہا تھا۔ اس نے بے ساختہ نگاہیں جھکالیں۔ کمرے میں پردے پڑے ہوئے تھے۔ دروازہ بھی بند تھا جس سے خاصی تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ اس کے دھیمے مسکراتے لب' تمسخرانہ نگاہیں اس بات کی گواہ تھیں کہ وہ سب سن چکا ہے مارے توہین کے اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ وہ یکلخت وہاں سے نکل آئی اور باہر ریلنگ کے پاس بیٹھ کر خوب روئی۔ اسے شدید دکھ تھا ملازمت چھوٹ جانے کا۔ اتنی بہترین ملازمت ہر بار نہیں ملتی' بلکہ چھوٹی موٹی بھی ملازمت آج کل آسانی سے کہاں ملتی ہے۔ فیکٹری میں اسی کی وجہ سے باآسانی بلا کسی تردد کے وہ سلیکٹ کرلی گئی تھی۔ اب کون تھا؟ جو اس کے لیے

تگ ودو کرتا۔ آنٹی پر بوجھ بنتا اس کی خودداری پسند نہیں کرتی' عزت نفس اسے ازحد عزیز تھی۔

♣ ــــــ ♣ ــــــ ♣

"معاذ! کب تک اس گھر کا آنگن سونا اور ویران رکھو گے؟ کیا چاہتے ہو' میں اپنے پوتے' پوتیوں کو ہنستا' کھیلتا دیکھے بغیر ہی دنیا سے چلی جاؤں؟" وہ حسرت زدہ لہجے میں گویا ہوئیں۔

"ماما! ایسی باتیں کیوں کرتی ہیں آپ؟" اس نے ان کے قریب بیٹھتے ہوئے خفگی بھرے لہجے میں کہا۔

"مجھے کہتے ہوئے عرصہ گزر گیا ہے بیٹا! میرے بیمار وجود میں اب طاقت نہیں رہی اس گھر کو سنبھالنے کی۔ ملازموں کے سپرد گھر کرکے آپ نے دیکھا؟ کیا گھر کا نقشہ بگاڑ دیا تھا۔ ملازموں کو صرف تنخواہ سے غرض ہوتی ہے گھر سے نہیں۔ گھر کا خیال گھر والی ہی کرسکتی ہے۔" انہوں نے دھیمی آواز میں کہا۔

"میرا پرابلم معلوم ہے ماما آپ کو؟ میں کسی عورت پر یقین نہیں کرسکتا' میرا ارادہ نہیں ہے کبھی بھی شادی کرنے کا۔" اس کے وجیہہ چہرے پر تردد کی شکنیں تھیں۔ "عمیر کی اسٹڈی مکمل ہونے دیں پھر ارمان پورے کرلیجیے گا۔ دو سال کا عرصہ درکار ہے اسے انجینئر بننے میں۔"

"فضول باتیں مت کرو معاذ! کیا تمہیں اپنی ماں پر بھی اعتماد نہیں ہے؟ اگر ہر عورت تمہارے نظریے کے مطابق آوارہ بدچلن و بدکردار ہے تو بیٹا! یہ دنیا کب کی تباہ ہوچکی ہوتی پھر کوئی گھر نہیں بستا۔ عورتوں کا وجود دنیا سے سمٹ کر قبروں میں دفن ہوچکا ہوتا۔"

"آپ جلد از جلد صحت یاب ہوجائیں پھر سوچیں گے۔" اس نے حسب عادت انہیں ٹالا۔

"بہلاؤ مت مجھے! میں نے آپ کے لیے لڑکی پسند کرلی ہے۔" وہ اس کی طرف دیکھ کر بولیں۔

"کون...؟" اس کے چہرے پر کچھ رنگ چھائے تھے۔ ان کا جھکاؤ وہ سمجھ گیا تھا۔

"قندیل!" حسب توقع جواب ملا تھا۔ وہ مشتعل ہوکر کھڑا ہوگیا تھا۔

"کیا ہوا؟ قندیل ہی وہ لڑکی ہے جو اس گھر کو بیٹی کی طرح سنبھال سکتی ہے۔ اور کوئی برائی بھی نہیں ہے اس میں۔ خوب صورت' خوب سیرت' تعلیم یافتہ اور سگھڑ ہے۔ ہاں اگر آپ کو اعتراض ہے تو پھر زبردستی نہیں کروں گی۔ عمیر سے وہ سال بھر چھوٹی ہے۔ عمیر کو راضی کرلوں گی۔" وہ اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ دیکھتے ہوئے سکون سے بول رہی تھیں۔

"ابھی عمیر پڑھ رہا ہے۔ اس کا کیریئر ڈاؤن ہوجائے گا ماما! اس جادوگر لڑکی نے ایسا کیا جادو کیا ہے جو آپ کو اس کے علاوہ کوئی اور نظر نہیں آتا۔" جھنجلاہٹ سے برا حال تھا اس کا۔

"محبت اور تابعداری' خلوص و خدمت گزاری' اعلیٰ اخلاق بذات خود بڑا جادو ہیں۔ مجھے اس کی اسی محبت و خلوص نے لوٹ لیا ہے۔ عمیر کو بلاؤ میں اس سے بات کروں۔ جب تک وہ پڑھ رہا ہے تب تک نکاح کردیں گے' رخصتی اس کی پڑھائی کے بعد کردیں گے۔ اس طرح کوئی اعتراض بھی نہ کرے گا جوان بچی کے بلارشتہ گھر میں رہنے کا۔"

"اس سے بات کی ہے آپ نے؟ وہ مان جائے گی؟" اسے فرار کی نئی راہ نظر آئی۔

"اس کی فکر مت کرو اسے سمجھانا میرا کام ہے۔" ان کے لہجے سے ناراضگی جھلکنے لگی۔

"ماما! یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے۔ باہر کردیں آپ اس کی شادی۔"

"مشورہ نہیں مانگا ہے میں نے تم سے۔ اسے تم دونوں میں سے ایک کی بیوی بننا ہے۔ یہ میرا فیصلہ ہے اور جس نے میرا فیصلہ نہیں مانا میں اسے دودھ نہیں بخشوں گی۔"

"ما... ما! یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟" ان کی آخری بات پر وہ لرز کر رہ گیا تھا۔ پھر ایک لمحے وہاں نہیں رکا' تیزی سے کمرے سے نکل گیا تھا۔

♣ ــــــ ♣ ــــــ ♣

گھر کی فضا گھٹی گھٹی سی تھی۔ افشین بیگم خاموشی سے بیٹے کے جواب کا انتظار کررہی تھیں جس نے اس

معاملے میں بالکل بیگانگی اختیار کررکھی تھی۔ اس کا رویہ ان کے ساتھ پہلے جیسے ہی تھا۔ مگر انہوں نے سرد رویہ رکھا ہوا تھا۔ اسے دیکھتے ہی وہ گہری چپ سادھ لیتی تھیں۔

پھر جیسے پتھر سے پانی جھرنا بن کر نکل پڑتا ہے۔ صحرا میں پھول کھل اٹھتے ہیں' بنجر زمین میں سبزہ لہلہانے لگتا ہے۔ اسی طرح اس نے محسوس کیا۔ اسے اب گھر آنے کی جلدی رہتی ہے۔ گھر میں داخل ہوتے ہی نگاہیں اس کو ڈھونڈنے لگتی ہیں۔ وہ جو خود کو بہت سنگ دل و مضبوط سمجھتا تھا کیا معلوم تھا؟ دل شکست کھائے گا تو کس سے؟ جس کا بدترین دشمن رہا تھا۔ جذبوں سے فرار حاصل کرنے میں ناکامی نے اسے ششدر کردیا تھا۔ وہ اپنی کیفیت کسی پر عیاں نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"قندیل! گھر سے بھی نکلتی ہو کبھی' ہر وقت روبوٹ بنی رہتی ہو تم' عمیر آجائے ابھی تو کچھ دیر کے لیے باہر چلی جانا۔ باہر نکلنے سے طبیعت پر اچھا اثر پڑتا ہے۔" انہوں نے قریب بیٹھے چائے پیتے معاذ کو نظر انداز کرکے کہا۔ معاذ کو جو وہ جتانا چاہ رہی تھیں۔ اس کے چہرے کے بدلتے تاثرات سے انہیں بخوبی اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ ان کی بات کی معنی خیزی سمجھ چکا ہے۔

"میں گھر میں ٹھیک ہوں۔ مجھے گھومنا پھرنا اچھا نہیں لگتا۔" اس نے چائے کا مگ اٹھاتے ہوئے کہا۔

"اس عمر میں کیا خود پر تم نے بڑھاپا طاری کرلیا ہے' ساری زندگی صرف خدمتوں میں ہی گزار دو گی؟ پہلے اپنی ماں کی خدمت میں لگی رہیں' اب مجھ میں اور گھر میں لگی رہتی ہو۔ اپنے آپ پر بھی تو توجہ دیا کرو۔ اپنے بارے میں بھی تو کچھ سوچا کرو بیٹی!" ان کے لہجے میں حلاوت تھی۔ اس کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ وہ اپنے بارے میں کیا سوچتی؟ اب کچھ بچا ہی کیا تھا۔

♣ ــــــ ♣ ــــــ ♣

"سنو... شام کو تیار ہوجانا' ماما کہہ رہی تھیں تم کو گھر سے نکل کر سیر و تفریح بھی کرنی چاہیے۔ وہ درست کہہ رہی تھیں۔ زندگی میں اگر جمود طاری ہوجائے تو زیست بھاری پتھر بن جاتی ہے۔ بے رنگ' بے نور' بے حس' انسان پتھر نہیں ہے اس لیے زندگی میں زندہ دلی ضرور ہونی چاہیے۔ عمیر کے ایگزام ہونے والے ہیں اور مجھے بھی تم سے "خاص" بات کرنی ہے۔"

وہ حیرانگی و بے یقینی کے سمندر میں غوطہ زن تھی۔ ابھی اس سے وہ شخص مخاطب تھا جو اس کی شکل دیکھنے کا روادار نہ تھا۔ کتنے خوب صورت انداز میں اس سے مخاطب تھا۔ اس کا دل بری طرح دھڑکنے لگا۔

"قندیل! معاذ کی وجہ سے ہی تمہارا گھر بستے بستے رہ گیا تھا۔ لیکن اس وقت کی معاذ کی غیر دانشمندی آج کی عقلمندی میں ڈھل گئی ہے۔ رحمت بابا نے مجھے بتایا تھا اشرف صاحب تمہارے چچا کے ہم عمر تھے اور تمہارے چچا نے بزنس کے خسارے کے باعث یہ رشتہ طے کیا تھا تاکہ تمہاری صورت میں وہ اپنا قرضہ معاف کرواسکیں۔ مجھے مسرت ہے تم عفریت سے بچ گئی ہو۔ معاذ جوان ہے' خوب صورت اور معاشی لحاظ

غزل

شام فرقت کا باب رہنے دے
دل کی سادہ کتاب رہنے دے
تیری آنکھوں میں پڑھ لیا اے صبا
میرے خط کا جواب رہنے دے
کیسے جلووں کی تاب لاؤں گا
اپنے رخ پہ نقاب رہنے دے
ان کو دیکھا تو بے خود چھائی
اب تو ساقی شراب رہنے دے
تجھ کو خوشیاں نصیب ہوں ظالم
میرا خانہ خراب رہنے دے
راہ الفت میں ساتھ چلنے کا
ہم نے دیکھا جو خواب رہنے دے
شہر خوباں کی بات کر آزاد
ذکر حسن و شباب رہنے دے

محمد اکرام آزاد... سرگودھا

سے بہت مستحکم ہے۔ اس کے لیے لڑکیوں کی کمی نہیں ہے۔ لیکن میں معاذ کی دلہن کے روپ میں صرف تمہیں دیکھنا چاہتی ہوں۔“ افسین بیگم اندر معاذ کی گفتگو سن چکی تھی۔ باہر آکر وہ قندیل کو سمجھانے لگیں۔

”آنٹی! یہ کس طرح ہو سکتا ہے؟ آپ جانتی ہیں وہ مجھے ناپسند کرتے ہیں اور میں نے بھی کبھی اس انداز میں نہیں سوچا۔“ وہ ازحد انتشار کا شکار ہو گئی۔

”مرد کی ناپسندیدگی‘ پسندیدگی میں بدلتے دیر ہی کتنی لگتی ہے۔ آدم کی پہلی چاہ‘ پہلی خواہش‘ پہلی ضرورت وجود زن تھی اور یہ حقیقت ہے عورت کے بغیر تو جنت بھی مکمل نہیں پھر میرے بیٹے کی زندگی کس طرح مکمل ہو سکتی ہے۔ کسی خوب صورت و خوب سیرت لڑکی کے بنا‘ ماضی کی باتیں فراموش کر ڈالو۔“ آنٹی اسے سینے سے لگائے بالکل سگی ماں کی طرح سمجھا رہی تھیں اور وہ خواب و یقین کے درمیان تھی۔

الیکٹرک بلو کریشیہ نیٹ کے دوپٹے اور قمیص پر دیدہ زیب کڑھائی تھی۔ شلوار سلک کی تھی اس سوٹ میں اس کی سفید رنگت خاصی چمک رہی تھی۔ آنٹی نے زبردستی سوٹ کے ہمرنگ زرقون کا نازک سا سیٹ پہنا دیا تھا۔ ہونٹوں پر پنک لپ اسٹک سے اس کا سادہ حسن دمک اٹھا تھا۔ اسے آج آپ اپنا کتنا عجیب عجیب سا لگ رہا تھا۔ چند گھنٹوں میں ہی کایا پلٹ کر رہ گئی تھی۔ آنٹی نے اسے اپنے سامنے تیار کروایا تھا۔ وہ اس وقت ایک بہترین دوست ہونے کا رول پلے کر رہی تھیں۔ اسے عجیب سی گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ گوکہ آنٹی نے کھل کر بات کلیئر کر دی تھی۔ پھر بھی اسے نافہم سی بے چینی تھی۔

معاذ اسے پارک میں لے آیا تھا۔ راستہ خاموشی میں کٹا تھا۔ رات کی تاریکی دھیمی دھیمی پھیل رہی تھی۔ موسم اچھا تھا‘ آسمان پر پورا چاند اپنی چاندنی لٹا رہا تھا۔ بے شمار چمکتے دمکتے ستارے دلکشی کا باعث تھے۔ وہاں آراستہ رات کی رانی کے بے شمار پودوں میں کھلے پھلوں سے فضا بہت معطر و خوش گوار تھی۔ بچوں‘ بڑوں‘ جوانوں‘ بوڑھوں کے ہجوم وہاں پھیلے تھے۔ زیادہ رش جھولوں کی سائیڈ تھا۔ خاصا پر رونق و پرشور ماحول تھا۔ معاذ گھاس پر بیٹھ گیا تھا۔ ساتھ اسے بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ یہ گوشہ کچھ تاریک و سنسان تھا۔

”مجھے بات گھما پھرا کر کرنے کی عادت نہیں ہے اور نہ ہی فلمی ہیرو کی طرح پیار بھرے ڈائیلاگ بول سکتا ہوں۔“ کچھ توقف کے بعد اس کی گمبھیر آواز ابھرنے لگی۔ چہرہ جھکائے گھبرائی‘ لجائی سی‘ قندیل اس کے بے باک لہجے پر حواس باختہ ہونے لگی۔

”میری زندگی بہت شفاف و سپاٹ گزری ہے۔ میں نے کسی لڑکی میں کبھی دلچسپی نہیں لی۔ یا پھر کسی نے مجھے اس طرح متاثر نہیں کیا تھا۔“ اس نے گہری شوخ نگاہ اس کے دلکش چہرے پر ڈالی۔ ”ماما کا اصرار بہت عرصے قبل سے تھا کہ شادی کر لوں مگر میرے ذہن میں کوئی تصویر نہیں تھی۔ میں بہانے بناتا رہا مگر اب مجھے بھی احساس ہو رہا ہے اپنی بے رنگ زندگی میں خوشیوں کے رنگ بھر لینا چاہیے۔ تم میرا پرپوزل ٹھکراؤ گی تو نہیں؟“ اتنی اہم و مشکل بات اس نے بہت آسانی سے کہہ دی تھی اور نگاہیں اس کے گھبرائے‘ سٹپٹائے‘ بوکھلائے چہرے پر مرکوز کر دی تھیں۔ تندخو‘ گرم مزاج و بے حس معاذ کا یہ روپ بالکل انوکھا اور پروقار تھا۔ قندیل جو گھاس کے تنکے نوچ رہی تھی ایک دم ہی بلش ہو گئی اس نے جھکا سر مزید جھکا لیا۔

”قندیل! میں زبردستی کا قائل نہیں ہوں۔ شادی ساری زندگی کا ساتھ کے نام ہے اور اس معاملے میں لڑکی کی رائے ضرور لینی چاہیے۔ میں جانتا ہوں میں نے تمہیں بہت ستایا ہے۔ مگر سکون میرا ابھی قائم نہیں رہا تھا۔ وہ میرے ضمیر کی چبھن تھی یا تمہاری دی ہوئی بددعائیں تھیں۔ میں لمحے بھر سکون و اطمینان سے نہیں رہ پایا۔“

”پلیز! ماضی کا باب بند کر دیں جو میرے نصیب میں لکھا تھا وہ ہو کر رہا۔“ اس نے پہلی بار لب کشائی کی۔ معاذ نے قریب آتے ویٹر کو لمبا آرڈر دیا تھا۔

”میں نے زندگی بہت اسٹرونگ گزاری ہے۔ کسی

لمحے کوئی کمزوری محسوس نہیں کی۔ مگر آج محسوس کر رہا ہوں تمہیں کھونے کی ہمت نہیں رکھتا۔ اگر تم میری زندگی میں نہیں آئیں تو پھر کسی کے لیے دروازہ دل وا نہیں ہوگا۔ معاذ احمد جو کہتا ہے وہ کر کے بھی دکھاتا ہے۔“ اس نے اس کا برف ہاتھ اپنے گرم ہاتھوں میں لے کر پرعزم و چٹانی لہجے میں کہا۔

”ہاتھ چھوڑیں لوگ آ رہے ہیں۔“ اس نے بوکھلا کر سامنے چکنے فرش کی روشن پر دیکھتے ہوئے کہا۔

”تمہارے ہاتھ بہت خوب صورت ہیں۔“ وہ اس کی گھبراہٹ سے لطف اندوز ہوتا اس کا مخروطی انگلیوں والا سفید ہاتھ دیکھتا ہوا بھاری لہجے میں بولا۔

”پلیز چھوڑیں نا۔“ کچھ منچلے انہیں دیکھتے ہوئے جملے کستے گزر گئے تھے۔ شرم سے اس کا برا حال تھا۔ جبکہ معاذ مسکراتا ہوا ہنوز اس کا ہاتھ پکڑے بیٹھا تھا۔

”اوں۔۔۔ ہوں۔ پہلے بولو شادی کرو گی مجھ سے؟“

”یہ آپ اقرار کروا رہے ہیں یا جرم کا اعتراف کروا رہے ہیں۔“ وہ خفا ہو کر بولی۔

”جرم ہی کیا ہے تم نے ماید ولت کا دل چرا کر۔“

”ایک بات بتائیں گے؟“ اس کی نگاہوں کی والہانہ وارفتگی اسے ڈسٹرب کر رہی تھی۔

”ایک نہیں‘ ایک لاکھ پوچھو۔“ وہ نیم دراز ہو گیا۔

”راحیل۔۔۔ چچا کے کمرے میں بھوت کا اثر ہے مجھے وہاں۔۔۔“ اس کی بات ختم ہونے سے قبل ہی اس نے بلند قہقہہ لگایا تھا۔ سامنے سے گزرتے لوگوں نے پلٹ کر ادھر دیکھا تھا۔

”دیکھو مائنڈ نہیں کرنا۔“ وہ اس کی طرف جھک کر بولا۔ ”وہ ساری حرکتیں میں کرتا تھا تاکہ تم خوف زدہ ہو کر وہاں سے بھاگ جاؤ وہ ماسک میں لگاتا تھا۔ چچا کے کمرے کی چابی میرے پاس ہی رہتی ہے۔ میں ہی دروازہ کھولتا بند کرتا۔ قہقہے بھی تمہارے کمرے کی کھڑکی کے پاس رومال میں منہ چھپا کر لگاتا تھا تاکہ نانی اور ماما کے کمرے تک آواز نہ جائے۔ مگر تم بہت بہادر ثابت ہوئیں وہ کمرا چھوڑ کر ماما کے کمرے میں رہنے لگیں اور میرا باقی کا پلان فیل ہو گیا اور سوچتا ہوں اچھا ہی ہوا۔“

”آ۔۔۔ آپ! اس قدر چیٹر ہیں؟ اومائی گاڈ!“ قندیل حیرانگی سے اچھل سی گئی تھی۔

”تمہاری فیکٹری جانے کی روش مجھے ہرگز پسند نہیں تھی۔ میں نے تمہیں خود بھی سمجھایا مگر تم میرے خلاف بھری بیٹھی تھیں۔ میری بات پر مشتعل ہو گئی تھیں۔ میں بھی غصے میں نہ معلوم کیا کیا بول گیا تھا جس کا مجھے بعد میں افسوس ہوا کہ بہرحال میں کم ظرف و پست ذہنیت کا نہیں ہوں۔ ماما نے بھی کہا ابھی تم صدمے میں ہو مصروف ہو جاؤ گی تو بہل جاؤ گی۔ مگر جانتا تھا تم بہلنے والی نہیں ہو۔ سو ڈائریکٹ وہاں سے رابطہ کرنا پڑا۔ وہ اپنی لائق و محنتی ورکر کو چھوڑنے پر راضی نہ تھے۔ پھر مجبوراً مجھے اپنا اثر و رسوخ استعمال کرنا پڑا۔ تب کہیں جا کر وہ تمہاری ہمیشہ کے لیے چھٹی کرنے پر رضامند ہوئے تھے۔“

”یا اللہ! کتنے زبردست ایکٹر ہیں آپ! بالا ہی بالا سب کچھ کرتے رہے اور گھر میں ایسے بے پروا اور اجنبی بنے رہے۔“ وہ حیرانگی در حیرانگی کی زد میں تھی۔

”اب ایسی نظروں سے نہیں دیکھو! سب تمہاری محبت کے زیر اثر ہوا ہے۔“

”یہ محبت ہے آپ کی؟ میں کتنی پریشانی میں رہی؟ اس کا احساس نہیں ہے آپ کو۔“ وہ بے اختیار رونے لگی۔ آنسو سراسر مسرت و طمانیت کے تھے۔ اس کی صحرا زیست میں پھول کھل اٹھے تھے۔ اسے یقین تھا معاذ جیسا بلند حوصلہ و ثابت قدم شخص اس کی تمام محرومیوں کا ازالہ کر دے گا۔

”ارے۔۔۔ ارے خاموش ہو جاؤ‘ دیکھو سامنے سے ویٹر سامان لے کر آ رہا ہے۔ میں نے کوئی گستاخی کی تو تمہیں اعتراض ہوگا۔“ اس نے شوخی سے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ تو قندیل نے برق رفتاری سے آنسو صاف کیے۔ معاذ کے چہرے پر بھرپور مسکراہٹ دوڑ گئی۔

